مختارانہ حکومت کرتا رہا جو ان ترکمانی ریاستوں نے جو سلجوقی سلطنت کے خاتمے پر وجود میں آئیں آپس میں تقسیم نہیں کر لیے تھے، یعنی کم و بیش مستقل طور پر نگدہ، آق سرائے، انقرہ، دِوہ لی، قرہ حصار، دِرِندہ، اماسیہ، توقاد، مَرزِیفُون، سَمسُون، اَرزِنجان اور شرقی قرہ حصار کے صوبوں پر؛ اس کا دارالحکومت پہلے سِیْواس اور پھر قیصری رہا۔ وہ اپنے آپ کو سلطان کہتا تھا، اس نے علاء الدین کا لقب اختیار کیا اور اپنے نام کا سکّہ ڈھلوایا۔ وہ عربی جانتا تھا اور علما اس کا شمار اہلِ علم میں کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی رعایا اس کے حسنِ انتظام کے اعتراف میں، جس کی بدولت اس پُرآشوب زمانے میں ایک حد تک امن و امان قائم تھا، اسے کوسہ پیغمبر، یعنی چھدری ڈاڑھی والا پیغمبر، کہا کرتی تھی۔ اس کا انتقال ۷۵۳ھ/ ۱۳۵۲ء میں ہوا اور اس کی ریاست اس کے بیٹے غیاث الدین (محمد) کے حصے میں آئی، جس نے مملوک سلاطین سے اتحاد قائم رکھا اور اپنے بھائی جعفر کی بغاوت کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

لیکن بیگ [امرا]، جیسا کہ ہر کہیں ان کا معمول تھا، یہاں بھی نظم و ضبط سے عاری تھے؛ چنانچہ ۷۶۶ھ/ ۱۳۵۶ء میں محمد ایک حملے کا شکار ہو گیا، جو انھیں کے اکسانے پر کیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے علاء الدین علی بیگ کے ماتحت، جو کہا جاتا ہے صرف عیش و عشرت کا دلدادہ تھا، اماسیہ، توقاد، شرقی قرہ حصار، حتّٰی کہ سیواس کے بیگوں اور خصوصًا اَرزِنجان کے بیگ تَہرتَن نے خود مختار و خود سر حاکموں کا سا رویہ اختیار کر لیا۔ دوسری جانب قرہ مانی اور عثمانلی ترکوں نے ارتنی ریاست کے مغربی مقبوضات چھین لیے اور آق قویونلو نے اس کے چند ایک مشرقی توابع۔ عملًا اب زمامِ حکومت قاضی برہان الدین [رکّ بآں] کے ہاتھ میں تھی، جو قیصری کے قضاۃ کی اولاد میں سے تھا۔ یہ قضاۃ پہلے فرمانرواؤں کے زمانے میں بھی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ علی ۷۸۲ھ/ ۱۳۸۰ء میں باغی بیگوں کے خلاف ایک مہم کے دوران میں مارا گیا۔ پھر جب مختلف دعوے داروں کے درمیان باہم کش مکش شروع ہوئی تو برہان الدین نے نوجوان وارثِ تخت محمد ثانی کو برطرف کر کے اپنے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا اور یوں اس خانوادۂ شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

ہمیں جو دستاویزیں ملی ہیں ان کی صورت بدقسمتی سے کچھ ایسی ہے کہ ارتنی حکومت کا ٹھیک ٹھیک نقشہ قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان بیانات (ابن بطّوطہ، العُمری) سے، جو اس ریاست کے آغاز ہی میں مرتّب ہوے، ایک تذکرے (بزم و رزم) نیز اس کے خاتمے سے دس یا بیس برس بعد سیّاحوں (شِلٹ برگر (Schiltberger)، کلاویزو (Clavijo)) کے قلم بند کردہ حالات کے باہمی مقابلے سے کچھ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ارتنا کے اس نظامِ حکومت کی نئی بات یہ تھی، جس کی عملی حقیقت ابھی تحقیق طلب ہے، کہ یہاں مغل حکومت کے زمانے سے لے کر عثمانلی حکومت کے آغاز تک کسی ترکمان خاندان کی حکومت نہیں رہی، جیسا کہ اردگرد کے علاقوں میں ہوتا رہا۔ مرکزی صوبوں میں بظاہر ترکمانی عنصر بچے کھچے مغل قبائل کے مقابلے میں کمزور تھا۔ شہروں کو ایک حد تک فارغ البالی حاصل تھی۔ امرا کی تہذیب اور اسی طرح تجارت کا رخ گزشتہ عہد سے زیادہ عربی بولنے والی مصری، شامی سلطنت کی طرف تھا، گو ایرانی تہذیب و تمدّن سے دلچسپی ابھی باقی تھی۔ اس بدلی ہوئی صورت پر ضرورت سے زیادہ زور دینا غلط ہوگا۔

آس پاس کی اَور چھوٹی ریاستوں ہی کی طرح ارتنی حکومت میں بھی شہری اخیوں کی تنظیم اور قوت، امیرانہ (مولویہ) اور عوام پسند مذہبی سلسلوں کے رسوخ، فارسی سے ترجموں کی شکل میں ترکی ادب (سیواس کا یوسف مدّاح)، عالمانہ شاعری (برہان الدین کی، جس کا سہرا ایک حد تک ارتنی حکومت کے سر سمجھنا چاہیے) اور مقبول عام رزمیہ داستانوں (دوسرا دانش مند نامہ، جو توقاد میں مرتّب ہوا اور ایک سلجوقی الاصل تصنیف سے ماخوذ ہے) کا فروغ ہوا۔ ارتنی علاقوں میں فن کاری کے جو چند ایک نمونے ملتے ہیں ان میں کوئی خاص بات نہیں۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ برہان الدین کی حکومت نے، جو خود بھی ترکی نسل سے تھا، ارتنی روایات کو ترک کر دیا تھا۔

مآخذ: (۱) ازمنۂ وسطٰی کے ایک ہی مؤرخ ابن خلدون نے ارتنی خانوادۂ حکومت کی تاریخ کا ایک عمومی خلاصہ مرتّب کیا ہے، ۵:۵۵۸ ببعد؛ ممالیک سے ان کے روابط کے متعلّق ابن خلدون کے بیان کی تصدیق العینی کے زمانے تک کے مملوک مؤرّخین کی تحریروں سے ہو جاتی ہے؛ (۲) اس حکومت کی ابتدا کے بارے میں ابن بطّوطہ نے بڑی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں، ۲:۲۸۶ ببعد (طبع گب Gibb، ۲:۴۳۳ ببعد)؛ نیز (۳) شہاب الدین العمری نے طبع ٹائشنر (Taeschner)، ص ۲۸، بمواضع کثیرہ) اور (۴) افلاکی نے طبع یازیجی (T. Yazici)، انقرہ ۱۹۵۹-۱۹۶۱ء، ۲:۹۷۸ = ترجمہ Huart، ۲:۴۱۵، آخری باب) اور (۵) السبکی نے شافعی طبقات میں؛ (۶) اس حکومت کے خاتمے کے لیے، برہان الدین کے نقطۂ نظر سے، دیکھیے مؤخّر الذّکر کی تاریخ، بعنوان بزم و رزم، از عزیز بن اردشیر استر آبادی (طبع کلیسی رفعت)، استانبول ۱۹۲۸ء (شرح و تجزیہ، از گیز یکے H. H. Gieschke: *Das work des*......، ۱۹۴۰ء)؛ (۷) مشرقی سرحد کے لیے آق قویونلو سلطنت کی توسیع کی تاریخ، جو کتاب دیار بکریہ کے زیرِ عنوان مرتّب ہوئی، از ابوبکر تہرانی (نویں صدی ہجری/ پندرھویں صدی عیسوی کا نصف آخر) اور جسے حال ہی میں فاروق سیومر (Faruk Sümer) نے شائع کیا ہے (انقرہ ۱۹۶۲ء)؛ (۸) نیز دیکھیے ایرانی (حافظ اَبرو وغیرہ) اور عثمانلی (منجّم باشی، عربی متن مخطوطے میں) عمومی تاریخیں؛ (۹) شکاری کی تاریخی داستان (طبع م۔ مسعود کومن (Komen)، ۱۹۴۶ء) میں، جو قرہ مانیوں سے مخصوص ہے، ارتنیوں کا بار بار ذکر آتا ہے؛ طرابزونی، جینوآئی اور ارمن مآخذ کو بھی بنظرِ اِمعان دیکھ لینا چاہیے؛ (۱۰) سکّوں کی ایک عمدہ فہرست متحف استانبول کی کتاباتی فہرست میں موجود ہے، از احمد توحید، ۴:۳۴۶ ببعد؛ (۱۱) ارتنی علاقوں کا الواحی (کتباتی) مواد *RCEA*، ج ۱۵، میں موجود ہے، جو بالخصوص اسمٰعیل حقی [اوزون چار شیلی] (سیواس شہری، قیصری شہری، وغیرہ) اور Max van Berchen اور خلیل

ادہم کی تحقیقات پر مبنی ہے، در CIA، ۳: ۴۰ بعد؛ (۱۲) آثارِ قدیمہ کے لیے دیکھیے A. Gabriel: *Monuments turcs d' Anatolie*، ۲ جلدیں۔ یہاں بھی، جیسے دوسری جگہوں میں، اس امر کا امکان ہے کہ عثمانلی متون سے مزید معلومات حاصل کی جا سکیں، اس لیے کہ ہوسکتا ہے ان میں قدیم ادارت کے بعض خاکے محفوظ ہوں۔ علاوہ ان کے وقف نامے (وقفیہ) بھی ہیں جن کی اشاعت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پھر (۱۳) خلیل ادہم: دول اسلامیہ اور (۱۴) زمباور (Zambaur)، ص ۱۵۵، کے ماسوا زمانۂ حال کا عام بیان صرف (۱۵) اسمٰعیل حقّی اوزون چارشیلی کا ہے، بعنوان اندلو بیلکلری، باب ۵، جو زیادہ تر احمد توحید کے مقالے بنی ارتنہ پر مبنی ہے، در *TOEM*، ۵ (۱۳۳۰ھ): ۱۳-۲۲ اور جو (آ) ترکی میں اسی مصنّف کے تاریخی خلاصوں اور عثمانلی تاریخی، ج ۱، میں پھر سے شائع ہوا؛ (۱۶) نیز دیکھیے مصطفٰی آق طاغ (Akdağ): ترکیہ نگ اقتصادی و اجتماعی تاریخی، ۱۹۵۹ء، ۱: اشاریہ؛ (۱۷) زکی ولیدی طوغان: عمومی ترک تاریخنہ گرِش، ۱: ۲۳۲-۲۳۶، ۴۴۸؛ (۱۸) Spulen: *Mangolen*، خصوصاً ص ۳۵۵، اور برشم (Berchem)، خلیل ادہم، گیز یکے اور گابرئیل کی تصنیفات، جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے؛ نیز ادب کی تاریخیں اور آخر میں حال ہی کے زمانے کی کتاب (۱۹) I. Mélikoff: *La geste de Melik Danismend*، ۲ جلدیں، ۱۹۶۰ء، دیباچہ۔

(CL. CAHEN کاہن)

---

* **اُرُج**: شروع شروع کا ایک عثمانی مؤرّخ اور عادل نامی ایک ریشم فروش کا بیٹا، جو غالباً پندرھویں صدی کے وسط میں ادرنہ، میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی کے جو حالات ہمیں معلوم ہوے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ارج شاید اپنے ہی شہر میں کاتب کا کام کرتا تھا۔ اس کی موت کب اور کہاں واقع ہوئی؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ارج بن عادل، جس حد تک ہماری معلومات کا تعلّق ہے، نثر میں دولتِ عثمانیہ کی قدیم ترین تاریخ کا مصنّف ہے، جس کا عنوان تواریخ آل عثمان ہے اور جس میں ابتدا سے لے کر سلطان محمد ثانی فاتح کے عہد تک عثمانلی تاریخ کا ذکر آ گیا ہے۔ واقعات کے بیان میں اس کا طریقہ یہ ہے کہ جن باتوں کا اسے ذاتی طور پر علم نہیں وہ اُن میں قدیم مآخذ سے رجوع کرتا ہے۔ اُن میں اہم ترین یخشی فقیہ کا مناقب نامہ ہے۔ پھر چونکہ اس تذکرے کے متن کی بعض عبارتیں لفظ بلفظ زمانۂ مابعد کی تواریخ آل عثمان سے ملتی جلتی ہیں، جس کا مصنف معلوم نہیں کون تھا، للہذا خیال یہ ہے کہ ان دونوں کتابوں کا تعلّق شاید ایک ہی ماخذ سے ہے۔ سلطان محمد ثانی کے عہد حکومت کا بیان بڑا مفصّل ہے، اس لیے کہ ادرنہ قسطنطینیہ کے قریب ہی واقع ہے اور وہ شاید خود بھی ان حالات سے گزر چکا تھا جو اس نے قلم بند کیے؛ البتہ یہ طے نہیں کہ اس کا یہ تذکرہ کہاں ختم ہوتا تھا، اس لیے کہ ۱۹۲۷ء میں بابنگر (F. Babinger) کو جو مخطوطہ بوڈلین (Bodleian) میں ملا (Rawl. Or. 5) وہ آخر میں نامکمل ہے اور دوسرا مخطوطہ بھی، جو اس کے بعد دستیاب ہوا، یعنی اگرم (Agram) کی جنوبی سلافی اکیڈیمی (South Slav Academy) میں، Coll. Babinger، شمارہ ۶۷۳/۱۱ اس کا سلسلہ بھی قبل از اختتام ٹوٹ جاتا ہے۔ اوکسفرڈ کے متن کا ایک ایڈیشن، جس سے کیمبرج کا ایک مختلف سا نسخہ بھی ملحق ہے، بابنگر (F. Babinger) نے *Quellenwerke des islamischen Schrifttums*، ج ۲، ۱۹۲۵ء میں شائع کر دیا تھا، بعنوان *Die Frühosmanischen Jahrbücher des Urudsch*، مع ایک ضمیمے (Nachtrag) (ہانوور ۱۹۲۶ء) کے، تصحیحات اور تنقیحات کے ساتھ۔

مآخذ: (۱) بابنگر (F. Babinger)، در *GOW*، ص ۲۳ بعد، جہاں مزید تفصیلات بھی ملیں گی۔

(FRANZ BABINGER بابنگر)

---

* **اِرْجیاس (یا ارجیس) طاغی** (آج کل کا املا Erciyas): اَرجیاس وہی پہاڑ ہے جسے زمانۂ قدیم میں Argaeus Mons کہتے تھے، جسے حمد اللہ المستوفی (نزھۃ، ص ۹۸-۱۸۱) نے ارجاست کوہ لکھا ہے اور جو وسطی اناطولیہ کے پہاڑوں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ یہ ایک سرد شدہ آتش فشاں ہے، جس کی بلندی ۳,۹۱۶ میٹر (= ۱۲,۸۴۷ فٹ) ہے اور جو آس پاس کے میدان سے، جس کی بلندی اوسطاً ایک ہزار میٹر (تقریباً ۳,۲۸۰ فٹ) ہوگی، دفعۃً بلند ہو جاتا ہے۔ جنوبی رخ سے قیصری کے شہر سے اس کی مسافت تقریباً بیس کیلومیٹر (تقریباً $12\frac{1}{2}$ میٹر) ہے۔ محلّ وقوع ٹھیک ۳۸ درجہ، ۳۰ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۳۵ درجہ، ۳۰ دقیقہ طول بلد شرقی کے قریب قریب ہے۔ ارجیاس نے اس سارے میدان کو گھیر رکھا ہے جو تخمیناً ۴۵ کیلومیٹر (۲۸ میٹر) شرقاً غرباً اور ۳۵ کیلومیٹر ($۱۲\frac{1}{2}$ میٹر) شمالاً جنوباً چلا گیا ہے۔ بعض قدیم مآخذ میں اس کی آتش فشانی کا ذکر بھی آیا ہے۔ آج کل ارجیاس طاغ شجر و گیاہ سے سرتا سر عاری اور ہمیشہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ دریاے دِلی صُو (Deli-Su) اسی پہاڑ سے نکلتا ہے اور قرہ صُو (Kara-Su) یعنی قِزِل ایرماق کے ایک معاون میں جا گرتا ہے۔

وہ عام راستہ جس کا استعمال زمانۂ قدیم سے ہو رہا ہے اور جو تکر یئیلہ سی (Tekér Yaylesi) کی چراگاہوں (۲,۰۰۰ میٹر (۶,۵۶۱ فٹ) بلند) سے ہوتا ہوا ارجیاس طاغ کی مشرقی ڈھلانوں اور اس کے مشرق میں اس کے ہمسایہ کوچ طاغی (Koc Daghi) (۲,۵۰۰ میٹر = ۸,۲۰۲ فٹ) کے درمیان قیصری سے جنوبی سمت ایوِرک (Everk) اور دِوِہ لی (Develi) کو چلا گیا ہے؛ لیکن جنوبی سمت کا بڑا راستہ وہ ہے (اس کا استعمال بھی زمانۂ قدیم سے ہو رہا ہے) جو ارجیاس کے گرد چکر کاٹتا ہوا مغرب کی طرف جاتا ہے اور جس نے اینجہ صو (Incesu) ہوتے ہوئے نِگدِہ (Nigde) اور بُور (Bor)، یعنی قدیم زمانے کے طیانہ (Tyana)، کا رخ کر لیا ہے۔

اِرجیاس طاغ کی چوٹی پہلی مرتبہ ہملٹن (W. J. Hamilton) (۱۸۳۷ء)

نے سر کی اور پھر اس کے بعد چی ہچف (Tchihatchef) (۱۸۴۸ء)، ٹوتسر (Tozer) (۱۸۷۹ء) اور کُوپر (Cooper) (۱۸۷۹ء) نے۔ ان کے بعد اہم ترین چڑھائی پینتھر (Penther) اور اس کے ہمراہیوں کی تھی، جو ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء کے بعد پھر اس پر کئی چڑھائیاں کی گئیں (۱۹۲۸ء تک کی چڑھائیوں کی فہرست رِٹّر (E. J. Ritter) نے تیار کی ہے، *Erdjias Dag*، Innsbruck ۱۹۳۱ء، ص ۱۳۵ ببعد۔ اب چند دنوں سے یہ علاقہ برف سے پھسلنے (سکیٹنگ) کے کام میں آ رہا ہے۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa، ۲: ۶۸۴ (طبع ہرشفیلڈ)؛ (۲) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۱۴۶؛ (۳) اِوْلیاء چلبی: سیاحت نامہ، ج ۳، استانبول ۱۳۱۴ھ: ص ۷۶ ببعد؛ (۴) کاتب چلبی: جہان نُما، ص ۶۲۰؛ (۵) H. v. Moltke: *Briefe über Zustände und Begebenheiten in der Türkei*، برلن ۱۹۱۱ء، خصوصاً ص ۳۳۰؛ (۶) اِرجیاس داغ کے مآخذ پر (ہملٹن کے بعد) بِسیم دَرکوٹ (Besim Darkot) نے اپنے مقالہ *Erciyas-Daği*، در *JA*، ۴: ۲۸۶-۲۸۸، میں جدید تصنیفات ذکر کر دی ہیں؛ ان میں ایک نہایت ہی اہم رسالے کا اضافہ کر لینا چاہیے یعنی (۷) Gerhart Bartsch: *Das Gebiet des Erciyes Daği und die Stadt Kayseri in Mittel-Anatolien*، در *Jahrbuch der Geographischen Gesellschaft zu Hannover für 1934 und 1935*، ہانوور ۱۹۳۵ء، ص ۸۷-۲۰۲۔

(F. TAESCHNER)

✱ **اَرْچی:** (اَرْشَشْدِب)، بالائی داغستان کی ایک قلیل التعداد قفقازی قوم، جو اَوار [رَكَ بآن] سے مماثل ہے، لیکن اَنْد و ۔ دِیڈو (Ando-Dido) کے نسلی گروہ سے مختلف ہے (رَكَ بہ مادّۂ اَندی، دِیڈو) ۱۹۲۳ء میں اس قبیلے کے آدمیوں کی تعداد انیس سو تیس تھی، جو قرہ کوئی سُو (داغستان کی خود مختار سوویٹ جمہوریہ) کی بلند وادی میں آباد تھے۔ اَرچی لوگوں کی اپنی علٰیحدہ زبان ہے، جو آئبیری قفقازی (Ibero-Caucasian) زبانوں کی داغستانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے اور اَوار [رَكَ بآن] اور لَگ [رَكَ بآن] کے درمیانی مرحلے کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ زبان ابھی ضبطِ تحریر میں نہیں آئی اور اَرچی لوگ اَوار زبان کو اور اس سے کم درجے پر روسی اور لگ زبانوں کو ثقافی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد سے یہ قوم اَوار قوم میں مدغم کر دی گئی ہے۔ ارچیوں کو اَوار لوگوں نے پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمان کیا اور وہ بھی انھیں کی طرح شافعی المذہب سنّی ہیں۔

مآخذ: (۱) A. Dirr: *Arčinskiy-yazîk*، در *Sbornik Mate-ryalov dlya opisanii mestnostey i plamën Kavkasa*، ج ۳۹، تفلس ۱۹۰۸ء؛ نیز دیکھیے مادّۂ اَوار، اندی، داغستان، لگ۔

(H. CARRÈRE d' ENCAUSSE)

✱ **اَرْدَبّ:** رَكَ بہ مادّۂ کَیْل۔

✱ **اَرْدَبِیل:** (ترکی اِرْدِبیل)، مشرقی آذربیجان کا ایک ضلع اور شہر، جو ۴۸° ۴۸-۱۷ طول بلد مشرقی (گرینچ) اور ۳۸° ۱۵-۳۸ عرض بلد شمالی پر واقع ہے۔ سڑک کی راہ تبریز سے اس کا فاصلہ ۲۱۰ کیلومیٹر ہے اور سوویٹی سرحد سے ۴۰ کیلومیٹر۔ یہ سطح بحر سے ۴,۵۰۰ فٹ کی بلندی پر ہے اور ایک مُدَوّر سطح مرتفع پر واقع ہے، جو پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ ضلع (شَہرِستان)، جس کا صدر مقام یہ شہر ہے، چار تحصیلوں (بخش) پر مشتمل ہے، یعنی اردبیل، نَمِین، آستارا، اور گَرمی۔

شہر کے ارد گرد درخت بہت کم ہیں اور زراعت کے لیے آب پاشی کی ضرورت پڑتی ہے۔ شہر سے کوئی بیس میل مغرب کی جانب کوہ سَوَلان (عرب جغرافیہ نویسوں کا سَبَلان) واقع ہے، جس کی چوٹی ۱۵,۷۸۴ فٹ بلند ہے اور ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ شہر اور صدر مقام والے بخش میں سردی کے موسم میں سخت سردی ہوتی ہے (درجۂ حرارت کی ماہانہ اوسط بالعموم درجۂ انجماد سے نیچے رہتی ہے)، اس لیے اس شہر کا شمار ''سردسیر'' علاقوں میں کیا جاتا ہے۔ باقی تینوں بخش ''گرم سیر'' علاقے میں شمار ہوتے ہیں۔ دریائے بَلِخْلُو یا بالِق صُو (یا چای) [=ماہی رود]، جو دریائے قرہ صُو کا معاون ہے، شہر کے جنوبی حصّے میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ شہر کے نواح میں گرم پانی کے چشمے ہیں، جو ہمیشہ سے سیّاحوں کے لیے باعثِ کشش رہے ہیں۔

اس نام کا اشتقاق یقین کے ساتھ متعین نہیں ہو سکا، لیکن مِنورسکی (Minorsky)، در *JA*، شمارہ ۲۱۷ (۱۹۳۰ء): ص ۶۸، نے اس لفظ کے معنی ''قانون مقدس کا بید مجنون'' تجویز کیے ہیں۔ اردبیل کی اسلام سے پہلے کی تاریخ معلوم نہیں، کیونکہ یہ نام صرف اسلامی زمانے میں ملتا ہے۔ السّمعانی نے اس نام کا تلفظ اَرْدُبِیل دیا ہے، مگر حدود العالم میں اسے اَرْدَوِیل لکھا گیا ہے۔ ارمنی زبان میں یہ اَرْتَوِیت کی شکل میں (Ghevond) اور بعد ازاں اَرْتَوِیل کی صورت میں آیا ہے۔ فردوسی اور یاقوت کہتے ہیں کہ اس شہر کی بنیاد ساسانی بادشاہ پیرُوز (۴۵۷-۴۸۴ء) نے رکھی تھی اور اس لیے اسے بادان پیروز یا آباذان فَیْرُوز [=فیروز آباد یا فَرُوز کرد] کہا جاتا تھا۔ قزوینی نے نزھۃ القلوب میں اس شہر کی بنا بہت پہلے کے ایک بادشاہ [یعنی کیانی سیاوش کے بیٹے کَیخسرو] سے منسوب کی ہے۔

پہلے کے اموی سِکّوں پر بطور ٹکسالی نشان حروف ''ات را'' (آذربیجان) منقوش ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کہ ان حروف سے اردبیل مراد ہے یا کچھ اَور، لیکن جب عربوں نے آذربیجان کو فتح کیا تو البلاذُری کے قول کے مطابق اردبیل مَرْزُبان (والی) کا محلّ اقامت تھا۔ عربوں نے یہ شہر معاہدے کی رُو سے لیا تھا اور [حضرت] علیؑ کے مقرر کردہ والی الاشعث نے اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ یہ شہر خلفاے بنوامیہ کے عہد میں غالبًا مسلسل طور پر صدر مقام نہیں رہا؛ مثلاً ۱۱۲ھ/

۷۳۰ء میں خَزَر نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مراغہ آذربیجان کا دوسرا صدر مقام ہو، اس لیے کہ بظاہر حکومت کا مرکز کبھی مراغہ رہا اور کبھی اردبیل.

اردبیل کے ضلع کو بابک [رَکَ بآن] کے فتنے سے نقصان پہنچا۔ یہ شہر دسویں صدی عیسوی کے اوائل میں خودمختار ساجی والیوں کی عمل داری میں تھا۔ اس ضلع کو مقامی امرا کی باہمی آویزشوں اور دسویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل میں رُوس کے حملوں کی وجہ سے سخت نقصانات اٹھانا پڑے۔ اوّلین درہم، جن پر اردبیل کا لفظ کندہ ہے، ۲۸۶ھ/ ۸۹۹ء کے ہیں.

اردبیل کے شہر کو مغلوں نے ۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء میں فتح کرکے برباد کر دیا اور اس کی سابقہ اہمیت زائل ہوگئی، یہاں تک کہ تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں صَفَوِی شیخ صفی الدّین نے اردبیل کو اپنے سلسلۂ تصوّف کا مرکز بنایا۔ ۱۴۹۹ء میں شیخ مذکور کی نسل میں سے اسمٰعیل، جو گیلان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، اردبیل واپس آیا اور اس نے اس شہر میں صفوی حکومت کی بِنا ڈالی اور اس کے کچھ عرصے بعد تبریز میں اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا.

اس کے بعد سے اردبیل صَفَویوں کی ایک زیارت گاہ بن گیا اور خاص طور پر شاہ عباس نے شیخ صفی کے مقبرے اور مسجد کو ہدایا سے مالا مال کر دیا، جن میں چینی کے ظروف اور قالین [اور ایک اہم اور بیش قرار کتب خانہ] بھی شامل تھے۔ صفوی حکومت کے خاتمے پر یہ شہر کچھ عرصے کے لیے ترکوں کے قبضے میں چلا گیا، لیکن نادر شاہ نے اسے دوبارہ لے لیا اور اسی شہر کے نزدیک مُغَان کے گیاہی میدان میں ۱۷۳۶ء میں تاجِ شاہی زیب سر کیا۔ عثمانلی ترکوں کے قبضے کے دوران میں اس شہر اور ضلع کی آبادی اور اراضی کا جائزہ لیا گیا، جس کی ایک نقل استانبول میں باش وِکالت اَرْشِوِی [رَکَ بآن] میں محفوظ ہے۔ نپولین کے عہد میں جنرل گاردان (Gardanne) نے اس شہر کے استحکامات تعمیر کیے اور فصیلیں بنوائیں اور عباس میرزا نے وہاں اپنا دربار لگایا.

وہ یورپی سیّاح جو اس شہر میں آئے اور جنھوں نے اس کا مختصر سا حال لکھا حسبِ ذیل ہیں: Pietro della Valle (۱۶۱۹ء)، Adam Olearius (۱۶۳۷ء، اس نے اپنے سیاحت نامے میں شہر کا مصوّر نقشہ بھی دیا ہے)، J. B. Tavernier، Corneille Le Brun (۱۷۰۳ء) اور James Morier (۱۸۲۱ء)۔ شیخ صفی کی درگاہ کے کتب خانے کا بڑا حصّہ اور فنّی نوادر روسی ۱۸۲۷ء کے بعد اٹھا کر سینٹ پیٹرزبرگ لے گئے.

Morier (*Second Journey*) نے شہر کی آبادی کا اندازہ چار ہزار لگایا تھا۔ اب آبادی تیس ہزار کے قریب ہے۔ تاریخی عمارات میں مقبرۂ شیخ صفی، مسجد جمعہ (تعمیر شدہ ۱۳۸۲ء)، [مدرسۂ چینی خانہ] اور مقبرۂ شیخ جبرائیل (شیخ صفی کے والد؟) قابلِ ذکر ہیں۔ [ان کے علاوہ شاہ اسمٰعیل صفوی، شاہ طہماسپ صفوی، شاہ اسمٰعیل ثانی، شاہ محمد خدابندہ اور شاہ عباس اوّل کے مقبرے یہیں مقبرۂ شیخ صفی کے قرب و جوار میں واقع ہیں]۔ شیخ جبرائیل کا مقبرہ اردبیل کے شمال میں چھے کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے.

مآخذ: (۱) P. Schwarz: *Iran im Mittelalter*، ۸ (۱۹۳۵ء): ۱۰۲۶ - ۱۰۴۷، اس میں اسلامی مآخذ کے حوالے حواشی میں دیے گئے ہیں؛ (۲) F. Saare: *Ardabil Grabmoschee des Schech Safi*، در *Denkmäler persischer Kunst*، حصہ ۲، برلن ۱۹۲۵ء؛ (۳) J. A. Pope: *Chinese Porcelains from the Aradabil Shrine*، واشنگٹن (ڈی - سی -) ۱۹۵۶ء؛ (۴) لی سٹرینج (Le. Strange): *Lands*، ص ۱۶۸؛ (۵) رزم آرا: فرهنگِ جغرافیای ایران، ۴ (تہران ۱۹۵۲ء): ۱۱ - ۱۳؛ (۶) ده خدا: لغت نامه، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۹۰ - ۱۲۹۲؛ (۷) راه نمای ایران (وزارتِ جنگ بنگاه خریطه سازی، تہران ۱۹۵۲ء)، ص ۱۰ - ۱۲ (جہاں شہر کا نقشہ بھی دیا گیا ہے)؛ [(۸) مسعود کیہان: جغرافیای مفصل ایران، ۱۳۱۰ - ۱۳۱۱ھ، ۲: ۱۶۶؛ (۹) آآ، ترکی، بزیرِ مادّہ (مقالہ از میرزا بالا)].

(R. N. FRYE فرائی)

---

* **اَرْدِسْتان:** (عام بول چال میں اَرْدُسُون)، ایران کا ایک شہر، جو صحرا کے کنارے نطنز سے نائین کو جانے والی موجودہ سڑک کے مشرق میں واقع ہے۔ اس مقام کی بلندی سطحِ سمندر سے ۳,۷۷۵ فٹ اور محلِّ وقوع ۳۳° ۲۲َ عرض بلد شمالی اور ۵۲° ۲۴َ طول بلد مشرقی (گرینچ) ہے۔ قرونِ وسطٰی میں یہ ایک مشہور شہر تھا۔ عربی اور فارسی کتبِ تواریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ پہلے ساسانی بادشاہ اَرْدَشِیر (۲۲۶ - ۲۴۲ء) نے یہاں ایک آتش کدہ تعمیر کرایا تھا اور خسروِ اوّل انوشیروان (۵۳۱ - ۵۷۹ء) یہیں پیدا ہوا تھا۔ یہاں کی قدیم ترین (چوتھی صدی ہجری/ دسویں صدی عیسوی) مسجد کی کیفیت کے لیے قب A. Godard، در آثار ایران، ۱۹۳۶ء، ص ۲۸۵۔ اَرْدِسْتان کے شمال مشرق میں قریب ہی زَوارہ نامی ایک جگہ ہے، جہاں ایک پرانی مسجد اور زمانۂ قبل از اسلام کے کچھ کھنڈر موجود ہیں۔ پچاس گاؤں کے اس ضلع کی آبادی (۱۹۳۰ء میں) ستائیس ہزار کے قریب تھی.

مآخذ: (۱) Schwarz: *Iran*، ۵: ۶۳۸؛ (۲) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۲۰۸؛ (۳) علی اکبر ده خدا: لغت نامه، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۱۶۹۲؛ (۳) مسعود کَیہان: جغرافیا، تہران ۱۹۳۳ء، ۲: ۴۲۵؛ (۴) شہر کے خاکے اور موجودہ شہر کے کوائف کے لیے قب رهنمای ایران (طبع وزارتِ جنگ بنگاه خریطه سازی)، تہران ۱۹۵۲ء، حصہ ۲: ۴.

(R. N. FRYE فرائی)

---

* **اَرْدَشِیر:** قدیم فارسی کا اَرْتَخْشَثْرَہ یونانی کا Αρταξέρξης ایران کے فرماں رواؤں کا مشہور نام۔ اسلامی روایات میں صرف اس نام کے آخری دور کے

ساسانی بادشاہوں کا ذکر آتا ہے، یعنی اردشیر اوّل (۲۲۶-۲۴۱ء)، اردشیر ثانی (۳۷۹-۳۸۳ء)، اردشیر ثالث (۶۲۸-۶۲۹ء) [رکّ بہ مادّۂ ساسانیہ].

مآخذ: (۱) A. Christensen: *L' Empire des Sassanides* (مقدّمہ، ۲:۲ Littératures arabe et persane اور اشاریہ بذیل مادّۂ اردشیر).

(H. MASSÉ ماسے)

---

* **اَرْدَشیر خُرَّہ:** رکّ بہ فِیْرُوْز آباد.

---

* **اَرْدَکان:** (عوامی بولی میں اِرْدِکُون)، ایران کا ایک شہر جو ۳۲° -۱۸ عرض بلد شمالی اور ۵۳° -۵۰ طول بلد مشرقی (گرینچ) میں صحرا کے کنارے اس شاہراہ پر واقع ہے جو آج کل نائین کو یَزْد سے ملاتی ہے۔ اس کے شمال میں عَقْدا کا ضلع (بُلوک) اور جنوب میں مَیْبُود ہے۔ سطح بحر سے اس کی بلندی ۳,۲۸۰ فٹ ہے۔ بطلمیوس نے اپٹیکسا وا (Αρταχάνα)، نام کے جس شہر کا ذکر کیا ہے (ٹوماشِک Tomaschek، در Pauly-Wissowa، بذیل مادّہ) اسے یہی شہر قرار دینا محلّ نظر ہے، کیونکہ اس شہر میں پرانے کھنڈر بالکل نہیں ہیں۔ البتہ ابن حَوْقل (طبع کرامرز (Kramers)، ص ۲۶۳) نے یزد کے قریب صحرا کے کنارے پر اَذْرکان نامی ایک شہر کا ذکر کیا ہے اور اسے اَرْدَکان سمجھا جا سکتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی سے پہلے اس شہر کا کوئی یقینی ذکر نہیں ملتا۔ اس سال یہاں صوفیوں کی ایک خانقاہ تعمیر ہوئی، (قبّ عبدالحسین آیتی: تاریخ یزد، یزد ۱۹۳۹ء، ص ۵۰)۔ اس مصنّف نے اس شہر کے مشہور اشخاص کی فہرست بھی دی ہے۔ اردیکان (Ardecan) کا نام پہلے پہل اٹھارھویں صدی عیسوی کے اوائل کے یورپی نقشوں میں نظر آتا ہے، آج کل یہ شہر ایک ضلع (بلوک) کا مرکز ہے، جس میں پانچ گاؤں ہیں اور آبادی ۱۰,۴۳۰ ہے (۱۹۳۰ء میں)، بقول مسعود کیہان: جغرافیا، ج ۲، تہران ۱۹۳۳ء: ۴۳۸۔ کچھ باشندے زرتشتی ہیں۔ یہاں کے لوگ دھات کے کام اور مٹھائیاں بنانے کے لیے مشہور ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں کی پارچہ بافی اور قالین سازی کی صنعت عروج پر تھی، لیکن اب اس کی وہ اہمیّت باقی نہیں رہی۔

مآخذ: (۱) علی اکبر دِہ خدا: لغت نامہ، تہران ۱۹۵۰ء، ص ۱۷۴۷؛ (۲) جنرل رَزْم آرا: جغرافیای نظامی ایران، تہران ۱۹۴۵ء؛ (۳) یورپی سیّاحوں کے حوالوں کے لیے قبّ A. Gabriel: *Die Erforschung Persiens*، وی انا ۱۹۵۲ء، ص ۵۸ (von Poser)، ص ۱۸۸ (Buhse)، ص ۳۰۴ (Baier)؛ (۴) Stahl، در *Peterman's Geogr. Mitteil*، تکملہ ۱۱۸، (۱۹۵۸ء)، ص ۲۹.

ایک اور اَرْدَکان ولایتِ فارس میں ۳۰° -۱۶ عرض بلد شمالی اور ۵۱° -۵۹ طول بلد مشرقی (گرینچ) پر واقع ہے اور قشقائی قبیلے کا مرکز ہے۔

(R. N. FRYE فرائی)

---

* **اِرْدِل:** اِرْدِیل یا اِرْدِلستان، ہنگاروی مجری میں: اِرْدِیلے (Erdely) (از Erdö elve = "جنگل پار")؛ رومانوی میں: اَرْدِیَل (Ardeal)؛ جرمن میں: زیبن بوُرگن (Siebenbürgen)؛ لاطینی نام: ٹرّا الٹرا سِلوٰاس (Terra Ultrasilvas)؛ لہٰذا آگے چل کر ٹرانسلوینیا (Transsilvania) جو ہنگاروی نام کا ترجمہ ہے، یعنی ٹرانسلوینیا کا صوبہ بحالت موجودہ۔ یہ صوبہ رومانیا کے مغربی حصّے پر مشتمل ہے۔ عثمانی مآخذ میں اِرْدِل کا نام سب سے پہلے روزنامۂ سلیمانی میں آیا ہے، جہاں ولایت اِنگورس (Engurus، ولایت اہلِ ہنگری) کے بادشاہ یانُوش (Yanosh) کی عثمانی لشکر میں شمولیت کا حال بیان کیا گیا، جس کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ پہلے اردل کا بے تھا (قبّ فریدون بے: مُنْشَآتْ طبع ثانی، استانبول ۱۲۷۵ھ، ۲: ۵۷۲)۔ اِرْدِل کی دوسری شکل اردلستان کا ذکر متأخّر مآخذ میں موجود ہے (نعیما، ج ۱، مختلف مقامات؛ اِوْلیاء چلبی: سیاحت نامہ، ۱: ۱۸۱؛ مصطفٰی نوری پاشا: نتائج الوُقُوعات، ۲: ۷۲)۔ جغرافیائی اعتبار سے اردل کی سرحد مشرق میں بُغدان (مولداویا Moldavia) ہے۔ جنوب میں افلاق (وَلّاچیا Wallachia)، جنوب مغرب میں (دریائے) بَنَتْ (جسے "آہنی دروازے" دِمیر (تمیروغیرہ) قپی اس سے جدا کرتے ہیں) اور شمال میں صوبہ مَرْمَرُوْش (Marmarosh)۔ ان حدود سے محدود اردل گویا ایک طاس کی شکل میں ہے، جسے تین طرف سے کارپیتھی (Carpathian) اور ٹرانسلوینی (Transylvanian) اَلْپِس (Alps) نے گھیر رکھا ہے اور جسے ہنگری کے میدان سے اِرچ گزیک (Érchegység؛ رومن Muntii Apuseni) کے پہاڑوں نے جدا کر دیا ہے، لیکن عثمانی عہد میں اردل بسا اوقات ان جغرافیائی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ہمسایہ ممالک تک بھی پھیلتا گیا۔ اردل کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اردل کا میدان، جس میں ہنگاروی میدان سے زیادہ نشیب و فراز ہے اور جس میں دریائے مُرِیش (Muresh) اور اس کے معاون بہتے ہیں، مشرق میں سِکلوں (Sekels) کی سرزمین، اور آخر میں جنوبی کوہ کارپیتھین کا علاقہ۔

عثمانی ترکوں کا اردل سے سب سے پہلے سابقہ آٹھویں/چودھویں صدی میں ہوا۔ ۷۶۹ھ/۱۳۶۷ء میں ڈینس (Dénes, Dennis) نے، جو وِدِیْن (Vidin) کا بانی (حکمران) تھا اور پھر اردل کا "وویوودا" (voyvoda) (شہزادہ) بن گیا، بلغاریوں کے خلاف [سلطان] مراد اوّل کی مدد سے جنگ کی۔ لہٰذا ہنگری اور اس لیے اردل کے خلاف پہلی عثمانی مہم کی تاریخ عاشق پاشا زادہ نے (طبع گیزے (Giese)، ص ۶۰) ۷۹۳ھ/۱۳۹۱ء دی ہے۔ ۸۲۳ھ/۱۴۲۰ء کی بڑی یلغار، جو [سلطان] محمد اوّل کے عہد میں کی گئی، یقیناً وِدِیْن (Vidin) کے سرحدی محافظ دستوں کا کام تھا۔ اگلے سال ڈنیوب کے سرحدی بے نے اِفْلاق کے وویوودا کے اُکسانے پر براشوف (Brashov) کے شہر پر قبضہ کر لیا اور اسے جلا ڈالا۔ ۸۲۹ھ/۱۴۲۶ء اور ۸۳۶ھ/۱۴۳۲ء میں دو اور حملے ہوئے، جن میں دوسرا اور یونس زادہ علی بے کی سرکردگی میں اِفْلاق کے بے

کے اشتراک سے کیا گیا۔ ترکی مؤرّخین نے علی بے کے ایک اور حملے کا ذکر بھی کیا ہے جو مراد ثانی کے ایما سے ۸۴۱ھ/ ۱۴۳۷ء میں ہوا (عاشق پاشا زادہ: کتاب مذکور، ص ۱۱۰؛ نَشْری: تواریخ آلِ عثمان، ولی الدین اِفندی مخطوطہ، عدد ۲۳۵۱، ورق ۱۷۷)۔ دوسرے سال سلطان خود پہلی مرتبہ اِفلاق کے بے وْلاد ڈراکُل (Vlad Dracul) کی معیت میں اردل کے علاقے میں داخل ہوا اور سِبِیْن (Sibin) تک بڑھتا چلا گیا (سعد الدین، ۱:۳۲۱)۔ ان سیکسن (Saxan) قیدیوں سے جو اس مہم میں ہاتھ آئے تھے ایک نے عثمانی رسم و رواج اور تنظیم کا نہایت دلچسپ حال لکھا ہے (*Cronica Abconterfayung der Türkei...*، آگس برگ ۱۵۳۱ء)۔ پھر جب یَنکو ہُنیا ڈیس (Yanku Hunyades) (ہنگاروی میں: ہنیادی یانوس (Hunyadi János)) ـــــ ولّاچیا کا ''بطلِ سفید'' ـــــ اس منظر پر نمودار ہوا تو ترکوں کے خلاف مزاحمت پہلے سے زیادہ سخت ہوگئی۔ اس نے ان سے ۸۴۱ھ/ ۱۴۳۷ء میں سمندر پر اور ۸۴۵ھ/ ۱۴۴۱ء میں بلغراد کے قریب جنگ آزمائی کی اور ۸۴۶ھ/ ۱۴۴۲ء میں عثمانی سپہ سالار مرید بے کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اسی سال ہنیادی نے، جسے اب ولاد دراکل کی حمایت حاصل تھی، روم۔ ایلی (رومیلی) کے بیلر بے خادم شہاب الدین پاشا کو ولّاچیا میں شکست دی۔ یوں بلقان میں اب ہنیادی کا پلّہ بھاری ہو گیا اور وارنا کی فیصلہ کن شکست تک برابر بھاری رہا۔ [سلطان] محمد ثانی کے عہد میں عثمانی حملوں کی پھر سے ابتدا ہوئی۔ ایک حملہ ۸۷۹ھ/ ۱۴۷۴ء میں ہنیادی کے بیٹے مَتھائیس (Matthias) کے خلاف کیا گیا۔ ۸۸۴ھ/ ۱۴۷۹ء میں تیس ہزار کا ایک لشکر اردل میں داخل ہوا مگر اسے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ ایک اَور حملہ ۸۹۸ھ/ ۱۴۹۳ء میں ہوا۔ اس کے بعد جب عثمانی حملے عارضی طور پر رک گئے تو اردل کے ہنگاروی اور ولّاچی کسانوں نے بغاوت کر دی (۹۲۰ھ/ ۱۵۱۴ء)، مگر اسے جاگیر دار سرداروں نے دبا دیا۔ اس میں اردل کے ووِیوودا جان زاپولا (John Zápolyai) (پیچوی، ۱:۱۰۸ میں: ساپولائی یانْوش) نے بڑا اہم حصّہ لیا۔ اس نے مُہاکز (Mohácz) کی جنگ کے بعد ۱۵۲۶ء میں اِسْتولنی بلگراڈ (Istolni Belgrad) [رَکّ بآن]، جرمن میں شٹول وائسن برگ (Stuhlweissenburg)، میں اپنے ہنگری کے بادشاہ ہونے کا اعلان کیا، مگر جب آسٹریا کے آرچ ڈیوک فرڈینڈ (Archduke Ferdinand) نے اسے دعوتِ جنگ دی تو وہ پولینڈ بھاگ گیا اور استانبول میں سفیر بھیج کر سلطان سے مدد کا خواستگار ہوا۔ اس کی یہ درخواست قبول کر لی گئی، لیکن اس شرط پر کہ وہ عثمانی سیادت تسلیم کر لے گا؛ چنانچہ زاپولا نے مہم وِی اَنا کے دوران میں خود حاضر ہو کر سلطان کی وفاداری کا حلف اٹھایا (فریدون بے، ۲:۵۷۰؛ عالی: کنہ الاخبار، مخطوطۂ دانش گاہ استانبول، عدد ۵۹۵۹/ ۳۲، ورق ۲۹۳)۔ ۹۳۶ھ/ ۱۵۳۰ء میں محمد پاشا سِلِسْتْرہ (Silistre) کے سنجق بے نے افلاق کے ووِیوودا ولاد (Vlad) کی اعانت سے براشوف پر قبضہ کر کے اسے زاپولائے کے حوالے کر دیا اور اس نے

سٹیفن باتھوری (Stephen Bathory) کو اردل کا ووِیوودا مقرّر کیا۔

اردل میں عثمانی سیادت (۹۴۸ھ/ ۱۵۴۱ء - ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء): ۱۵۴۰ء میں اپنی موت سے کچھ دن پہلے زاپولائے نے سلطان سے اس امر کی منظوری حاصل کر لی تھی کہ اس کا بیٹا جان زِگِسْمُنڈ (John Sigismund) (پیچوی: سیمون یانوش اور یانوش یگمون، ۱: ۲۲۸ و ۴۳۴ وغیرہ، لیکن دوسرے ترکی مآخذ میں اسے بالعموم اسٹیفن (Istephan) کہا گیا ہے) اس کا جانشین ہو گا، مگر اس مرتبہ ادائے خراج کی شرط پر؛ چنانچہ بُدِین (Budin) کی مہم کے دوران میں یہ لڑکا (سلطان) سلیمان قانونی کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس نے اسے ولایت اردل میں ایک سنجق عطا کر دی اور آگے چل کر ایک بادشاہت دینے کا وعدہ بھی کر لیا (قبّ عالی: کنہ الاخبار، ورق ۲۷۷)۔ ۹۴۸ھ/ ۱۵۴۱ء کے عہد نامے میں ترکی سیادت کی تصدیق کر دی گئی اور یہ طے پایا کہ خراج کی ایک رقم کے عوض اسے سلطان کی حمایت حاصل ہوگی۔ خراج کی رقم پہلے دس ہزار اشرفیاں (ducats) مقرّر رہوئی، جسے ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء اور ۱۰۱۰ھ/ ۱۶۰۱ء کے درمیان بڑھا کر پندرہ ہزار کر دیا گیا۔ پھر دس سال کے لیے معاف کر دیا گیا اور دوبارہ پھر دس ہزار مقرّر کی گئی۔ گیارھویں/ سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں اس رقم کو بڑھا کر پندرہ ہزار اور اس کے بعد چالیس ہزار طلائی سکّے (آلْتِیْن، آلتُوْن) کر دیا گیا۔ علاوہ اس کے یہ بھی دستور تھا کہ ہر سال دس ہزار سے ساٹھ ہزار طلائی سکّوں کی مالیت کا کوئی تحفہ (پیشکش) سلطان کو دیا جائے۔ اردل کا شاہزادہ مقامی ڈِیٹ (Diet) کی طرف سے نامزد ہوتا اور سلطان اس انتخاب کی منظوری دے دیتا، جس کی صورت یہ ہوتی کہ سلطان کی طرف سے اسے ایک زین وساز سے آراستہ گھوڑا، ایک پرچم، ایک تلوار اور ایک خلعت ارسال کیا جاتا تھا (شہزادہ اردل اور افلاق اور بغدان کے ''ووِیوودون'' کے فرقِ مراتب کے لیے دیکھیے نتائج الوقوعات، ۱: ۱۳۷)۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ بابِ عالی کسی نامزدگی کو ردّ یا کسی شہزادے کو برطرف کر دے، جیسا کہ ۱۰۲۲ھ/ ۱۶۱۳ء میں گابور باتھوری (Gábor Báthory) اور ۱۰۶۷ھ/ ۱۶۵۷ء میں جارج راکوکزی (George Rákóczi) کے معاملے میں ہوا۔ ان شہزادوں کا فرض تھا کہ ان کی خارجی حکمتِ عملی بابِ عالی کی مرضی کے مطابق رہے۔ اندرونی معاملات میں البتہ انھیں آزادی حاصل تھی، بابِ عالی میں ان کی نمائندگی شروع میں تو خاص ایلچیوں کے ذریعے ہوتی رہی، مگر پھر پہلا مستقل وکیل (قَپُوْ کَخْیاسی = کِدْ خُداسی، اردلی دستاویزوں میں کپیتھا (Kapitiha) ۹۶۷ھ/ ۱۵۶۰ء میں مقرر ہوا۔ یہ وکلا اردل کے بے اور تین مقامی ملتوں (ہنگارویوں، جرمنوں اور سیکلوں (Sekels) کی نمائندگی کرتے تھے۔ (اہلِ ولّاچیا کا قانونی وجود تسلیم نہیں کیا گیا تھا)۔ اس کی سکونت استانبول کے محلۂ بَلّاط کے اُس بازار میں تھی جسے آج کل مَجُرلَر یُوقوشو (ہنگاروی فراز = Hungrians' Rise) کہا جاتا ہے اور بغدان اور افلاق کے وکلا کی اقامت گاہوں کے قریب تھی۔

جس زمانے میں زگسمنڈ نابالغ تھا، ڈِیٹ (Diet) نے کروشیا (Croatia)

کے کیتھولک راہب (friar) George Martinuzzi- Uťyeszenicz، (Uteśenić) (عالی، ورق ۲۸۷: بَرَتہ (brata) یعنی بھائی) کو نائب السّلطنت مقرر کر دیا تھا، لیکن اُس نے ۱۵۵۱ء میں اردل کو ہاپس برگز (Hapsburgs) (آسٹریا کے حکمرانوں) کے حوالے کر دیا؛ لٰہذا روم ایلی کے بیلر بے محمد باشا صوقللی نے اردل پر فوج کشی کی (عالی، ورق ۲۸۷)۔ مارتِنُزّی نے عثمانلیوں سے صلح کر لی، لیکن ۱۵۵۲ء میں آسٹروی جرنیل کسٹلڈو (Castaldo) نے اس پر حملہ کر دیا، جس میں اس کی جان جاتی رہی۔ ایک اَور لشکر قرہ احمد پاشا کی سرکردگی میں بَنَت (Banat) بھیجا گیا، جس نے تمی شوارا (Temesvár) پر قبضہ کر لیا؛ لٰہذا ۱۵۵۳ء میں کسٹلڈو اردل سے پیچھے ہٹ گیا اور کچھ دنوں، یعنی ۱۵۵۶ء تک اس علاقے کے وویودا ہاپس برگ کی طرف سے حکومت کرتے رہے، تا آنکہ ۱۵۵۶ء میں ڈیٹ نے مادرِ شاہ ایزابیلّا (Isabella) اور جان زگسمنڈ کو واپس بلا لیا، جنھوں نے پولینڈ سے آ کر اردل کے بلگراڈ (اردل بلگرادی، رومانوی: اَلْبا جولیا (Alba Julia)، ہنگاروی: Cyulafehaérvár، جرمن: کارلس برگ Karlsburg) کو اپنا مرکزِ حکومت قرار دیا۔ جان زگسمنڈ نے ۱۵۵۹ سے ۱۵۷۱ء تک بلا شرکت غیرے حکومت کی، نہ صرف اردل بلکہ ہنگری کے شمالی اضلاع پر بھی، جہاں اس کا ہاپس برگ حکمرانوں کے ساتھ مسلسل مقابلہ ہوتا رہا۔ اگرچہ ۱۵۶۴ء میں سَتْمَر (satmar) کی مفاہمت کی رُو سے اس نے شہنشاہ فرڈینِنڈ کو ہنگری کا بادشاہ تسلیم کر لیا، مگر پھر بھی امن قائم نہ ہو سکا۔ لٰہذا جان نے سلطان سے مدد کی درخواست کی (قَبْ پیچوی، ۱: ۴۱۲)، جس پر سلطان نے ۱۵۶۶ء میں ایک مہم زِگتوار (Szigetvár) روانہ کی۔ اسی جان کی حکومت میں سیکلوں (Sekels) نے بغاوت کی، جس کے نتیجے میں ۱۵۶۲ء میں اُن کے روایتی حقوق منسوخ کر دیے گئے اور ۱۵۶۴ء اور ۱۵۷۱ء کے فیصلوں کے مطابق ڈیٹ (Diet) نے اردل میں مذہبی رواداری کا اعلان کیا۔ اس کے جانشین سٹیفن باتھوری (Stephen Báthory: ۱۵۷۱-۱۵۷۶ء) نے کسی نہ کسی طرح ہاپس برگوں اور ترکوں کے درمیان توازن قائم رکھا۔ وہ ایک طرف تو شہنشاہ مَکْسِمِلْیَن (Maximilian) کو ہنگری کا بادشاہ تسلیم کرتا تھا اور یوں گویا ۱۵۷۱ء میں عہد نامہ سپئیر (Speyer) کی رُو سے اس کا حلقہ بگوش بن گیا تھا اور دوسری جانب بابِ عالی کو برابر خراج ادا کرتا رہا۔ ۱۵۷۶ء میں اسے بابِ عالی اور اس کے وزیر اعظم صوقُللی محمد پاشا کی کوششوں سے پولینڈ کا بادشاہ منتخب کیا گیا (دیکھیے احمد رفیق: صوقللی محمّد باشا و لہستان انتخاباتی، در *TOEM*، چھٹا سال، ص ۶۶۴ بعد)۔ ۱۵۸۱ء تک اردل پر اس کے بھائی کِرسٹوفر باتھوری (Christopher Báthory) کی حکومت رہی اور پھر ۱۶۰۲ء تک (گو وقفوں کے ساتھ) اس کے بیٹے زگسمنڈ باتھوری (Sigismund Báthory) کی، لیکن مؤخر الذکر بابِ عالی سے اپنی وفاداری میں بار بار متزلزل ہو جاتا رہا؛ چنانچہ ۱۵۹۳ء میں وہ "مقدّس" محالفے (Holy League) میں شامل ہو گیا اور ۱۵۹۴ء میں اس وقت جب بظاہر وہ قوجہ سِنان پاشا کی ترکی فوج میں شامل ہو رہا تھا اس نے ترکی کے حامی فریق کے سربراہوں کو قتل کر دیا۔ اس نے بُغدان اور اِفلاق کے وویودوں کو بھی اُکسایا کہ ترکوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ بلکہ ۱۰۰۳ھ/ ۱۵۹۵ء میں اس فوج کو شکست دی جو ترکوں نے بغاوت کے قلع و قمع کے لیے بھیجی تھی، لیکن اس زبردست شکست کے بعد جو شہنشاہی (آسٹروی) عساکر کو تیسری Mezökeresztes کی لڑائی میں ہوئی وہ اردلستان سے نکل بھاگا اور زمامِ حکومت اپنے عم زاد بھائی کارڈینل انڈریاس باتھوری (Cardinal Andreas Báthory) کے حوالے کر گیا، جس کی تربیت دربارِ پولینڈ میں ہوئی تھی اور جو اسی لیے ترکوں کا طرف دار تھا، لیکن اسے اِفلاق کے باغی وویودا (voyvoda) میخال (Michael) نے شکست دی، جو خود آسٹریا والوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس پر مؤخر الذّکر نے ملک پر قبضہ کر لیا اور زِگسمُنڈ باتھوری (Sigismund Báthory) کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا کہ اردل پر پھر اپنا تسلّط جما سکے۔ ۱۶۰۳ء میں ایک سیکل (Sekel) امیر سیکلی موزز (Székely Mózes) نے ترکوں کی مدد سے آسٹرویوں کو ملک بدر کرنے کی ناکام کوشش کی؛ البتہ ایک اَور اردل امیر سٹیفن بُوچسکائی (Stephen Bocskay) کو، جو بھاگ کر ترکوں سے جا ملا تھا (نعیما، ۱: ۳۸۶)، کسی قدر زیادہ کامیابی ہوئی اور ۱۶۰۶ء کے عہد نامۂ وی انا کی رُو سے شہنشاہ روڈولف (Rudolf) نے بھی اسے اردل کا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس کی موت کے بعد حالات بگڑ گئے؛ چنانچہ گابور باتھوری (Gábor Báthory) نے بڑے ظلم و ستم سے حکومت کی (۱۶۰۸-۱۶۱۳ء)۔ ترکی مآخذ میں اسے "دیوانہ بادشاہ" کہا گیا ہے۔ کینیجہ (Kanije) کے بیلر بے اسکندر پاشا نے اسے معزول کر دیا اور کولوجار (Kolojvár) میں مجلس نمائندگان (Diet) کو مجبور کیا کہ اس کی جگہ گابور بیتھلن (Gábor Bethlen) کا انتخاب کریں۔ اس کا عہدِ حکومت اردل کی ریاست کا دورِ زرّیں تھا، مگر وہ ۱۶۲۹ء میں مر گیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تختِ حکومت خالی رہا۔ اس کی یہ حکمتِ عملی کہ ترکوں سے تعاون کے ساتھ ساتھ مقامی خود اختیاری کا تحفظ کرے جارج راکوکُزی (George Rákoczi) اوّل (۱۶۳۰-۱۶۴۸ء) نے پھر سے بحال کر دی۔ ۱۰۴۶ھ/ ۱۶۳۶ء میں ترک اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے کہ گابور کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ اس کے بھائی سٹیفن بیتھلن کو بٹھا دیں۔ جارج راکوکزی اوّل کا جانشین اس کا بیٹا جارج ثانی ہوا (۱۶۴۸-۱۶۵۷ء، ۱۶۵۸ء، ۱۶۵۹-۱۶۶۰ء)، جس نے بابِ عالی کی مرضی کے خلاف کوشش کی کہ پولینڈ کا تاج و تخت حاصل کر لے، لیکن اس میں ناکام رہا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا؛ لٰہذا اردل پر اب ترکی عساکر نے قبضہ کر لیا۔ کولوجار میں جو قیدی ترکوں کے ہاتھ لگے ان میں ایک نوجوان ہنگاروی بھی تھا، جس نے آگے چل کر اسلام قبول کر لیا اور ابراہیم مُتَفَرِّقہ [رکّ بآن] کے نام سے مشہور ہوا۔ کوپریلی [وزرا] کے عہد میں اردل پر ترکی سیاست پھر سے قائم ہو گئی، لٰہذا ۱۰۷۲-۱۰۷۳ھ/ ۱۶۶۲ء سے ۱۱۰۱ھ/ ۱۶۹۰ء تک وہاں ترکوں کا نامزد امیر میخائیل اپافی ای (Michael Apafiy) حکومت

کرتا رہا۔ جب ترکوں سے لڑائی میں آسٹریا کا پلّہ بھاری ہو گیا تو اردل کی خود مختاری ختم ہو گئی؛ چنانچہ میخائیل اپافی اوّل نے خود ہی ہاپس برگ فوجوں کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ ۱۱۰۲ھ/۱۶۹۱ء میں مشہور و معروف تصدیق نامہ (Diploma Leopoldinum) کی رُو سے اردل کو ہاپس برگ کی شاہی ملکیت قرار دیا گیا، گو اس کے باوجود مقامی مجلسِ نمائندگان (Diet) کی حیثیت جُوں کی تُوں قائم رہی۔ پھر جب ۱۱۱۰ھ/۱۶۹۹ء میں کارلووِٹس (Carlowitz) کا عہد نامہ ہوا تو اردل پر آسٹروی سیادت باقاعدہ تسلیم کر لی گئی۔ ۱۷۰۳ء میں فرانسس راکوکزی ثانی نے کوشش کی کہ اس صورت حالات کو پھر سے پلٹ دے؛ چنانچہ ایک مقامی بغاوت کے بعد اسے ۱۷۰۴ء میں حکمران منتخب کر لیا گیا، لیکن اس نے ۱۷۱۰ء میں شکست کھائی اور اگلے سال فرانس بھاگ گیا۔ ۱۱۲۷ھ/۱۷۱۵ء میں ترکوں نے پھر ایک بار کوشش کی کہ اسے آسٹریا کے خلاف لڑائی میں استعمال کریں، لیکن صلح نامۂ پساروِٹس (Passarowitz) کی رُو سے اسے اور اس کے ہنگاروی رفقا کو کنارہ کش ہونا پڑا، جس کے بعد وہ تکیرداغ (روڈوسٹو (Rodosto)، واقع تھریس) میں سکونت پذیر ہو گیا (قب راشد، ج ۴ و ۵، بمواضع کثیرہ؛ احمد رفیق: ممالکِ عثمانیہ دہ راکوجزی و توابعی، استانبول ۱۳۳۸ھ؛ ایم طیب گوکبِلگِن: راکوجزی فرنچ ثانی و توابعنہ دائر یکی وثیقہ لر، در *Belleten*، ۵/۲۰، ۱۹۴۱ء)۔ ایک ایسی ہی ناکام کوشش ترکوں نے اس کے بیٹے یوزیف (Jozsef) کو استعمال کر کے کی، لیکن ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں صلح نامۂ بلغراد نے ان کے اردل پر قبضہ جمانے کے منصوبوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

ترکوں کے بعد اردل کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات یہ ہیں: یونانی کلیسا کے پیرو مقامی رومانویوں کی تعدادِ کثیر کا پوپ کی اطاعت قبول کر لینا (۱۷۰۰ء کا اتحاد)؛ ۱۷۸۴ء کی بغاوت، جو رومانوی کسانوں نے برپا کی؛ ۱۸۴۸ء میں مجلسِ نمائندگان (Diet) کا فیصلہ کہ اردل ہنگری میں ضم ہو جائے؛ اور بالآخر ۱۹۲۰ء کے عہد نامۂ ٹریانون (Trianon) کی رُو سے اردل کا رومانیا سے الحاق.

مآخذ: (۱) A. Centorio degli Hortensi: *Commentarii della guerra di Transilvania*، وینس ۱۵۶۶ء؛ (۲) C. Spontone: *Historia della Transilvania*، وینس ۱۶۳۸ء؛ (۳) *Regni Hung-arici Historia...a nicolao Isthuanffio*، Coloniae Agrippinae ۱۷۲۴ء؛ (۴) G. Kraus: *Siebenbürgische Chronik* (Fontes Rerum Austriacorum، Österr. Akad. d. Wiss.، ج ۱، حصہ ۳ و ۴)، وی انا ۱۸۶۲-۱۸۶۴ء؛ (۵) طبع S. Szilágyi: *Monumenta comitalia regni Transylvaniae. Erdélyi Országgülési Emlékek*، ج ۱-۲۱، بوڈاپسٹ ۱۸۷۶-۱۸۹۸ء (MCRT)؛ (۶) وہی مصنف: *Transylvania et bellum boreoorientale*، بوڈاپسٹ ۱۸۹۰-۱۸۹۱ء؛ (۷) Hurmuzaki: *Documente Privitoare la istoria Românilor*، ج ۱-۳۲، بخارسٹ، از ۱۸۸۷ء، مع تکملہ جات؛ (۸) A. Szilády و Al. Szilágyi: *Törökmagyarkori államokmánytár*، بوڈاپسٹ ۱۸۶۸-۱۸۷۲ء، ج ۱-۷؛ (۹) *Monumenta Hungariae historica*، فصل ۲، ''Scriptores''؛ (۱۰) طبع A. Veress: *Basta György handv-ezér Sevelezése és Iratai (1597-1607)* [Monumenta Hungariae historica. Diplomataria، ج ۳۴-۳۷]، بوڈاپسٹ ۱۹۰۹-۱۹۱۴ء؛ (۱۱) طبع وہی مصنّف: *Fontes rerum Transylvanicarum*، ج ۱-۳، بوڈاپسٹ ۱۹۱۳ء؛ (۱۲) وہی مصنّف: *Documente privitoare la istoria Ardealului, Moldovei și Tării Românesti*، بخارسٹ ۱۹۲۹-۱۹۳۸ء، ج ۱-۱۲؛ (۱۳) R. Goos: *Österreichische Staatsverträge. Fürstentum Siebenburgen* (*1526-1690*)، وی انا ۱۹۱۱ء؛ (۱۴) G. E. Müller: *Die Türkenherrschaft in siebenbürgen*، [Südosteuropäisches Forschungs-Institut, Sekt. Hermannstadt, Deutsche Abteilung، ج ۲]، Hermannstadt، ۱۹۲۳ء؛ (۱۵) G. Bascapè: *Le relazioni fra l'Italia e la Transilvania nel Secolo XVI*، روم ۱۹۳۱ء؛ دیگر مآخذ کے حوالے متنِ مقالہ میں آ چکے ہیں۔ مزید کتابوں کے لیے دیکھیے مآخذ، در آ، ترکی، بذیلِ مادّہ.

(A. DECEI و ایم طیّب گوکبِلگِن)

---

* **اَرُدَلان:** پہلے یہ نام ایرانی صوبۂ کردستان کے لیے استعمال ہوتا تھا، جس کی حدود چنداں معیّن نہ تھیں اور جس کا بڑا حصّہ آج کل سَنَنْدَج (سابق سنّہ Senna) کے شَہرِستان (ضلع) میں شامل ہے۔ [اس کے] جغرافیے کے لیے دیکھیے مادّۂ کردستان (ایرانی).

عام طور پر اس نام کی نسبت بنو ارُدَلان کی طرف کی جاتی ہے، جو چودھویں صدی عیسوی سے کردستان کے بہت سے حصّے پر حکمران رہے۔ اس دیرپا خاندان کی اصل معلوم نہیں، لیکن شرف نامہ کے بیان کے مطابق بابا اردلان دیارِ بکر کے بنو مروان کی نسل سے تھا اور کردستان کے قبیلۂ گُوران میں آبسا تھا۔ ایک اَور ماخذ (B. Nikitine: *Les valis*) کی رُو سے ارُدَلان سب سے پہلے ساسانی بادشاہ ارُدشیر کی نسل سے تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں اردلان کے امرا کی متعدد تاریخیں فارسی زبان میں لکھی گئیں، جن میں زیادہ تر حکمرانوں کے سوانح حیات ہی درج ہیں (سٹوری Storey، ص ۳۶۹، ۱۳۰۰)۔ ارُدَلان کے حکمرانوں کو شاہانِ صَفوی کی طرف سے والی کا خطاب دیا جاتا تھا، لیکن بعض اوقات وہ عثمانلی ترکوں کی سیادت قبول کر لیتے تھے.

ان حکمرانوں کے ممتاز ترین افراد میں سے ایک امان اللہ خان تھا، جس کا

عہدِ حکومت انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس کے بیٹے کی شادی فتح علی شاہ [قاچار] کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ ناصر الدّین شاہ نے ایک قاچار شہزادے کو کردستان کا والی مقرر کر دیا اور اس طرح اردلان خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا (رک بہ مادّۂ کردستان وسِنّہ)۔

مآخذ: (۱) B. Nikitine: *Les Kurdes*، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۳۴-۳۶، ۱۶۷-۱۷۰؛ (۲) وہی مصنّف: *Les Valis d'Ardelan*، در *RMM*، ۴۹ (۱۹۲۲ء): ۷۰-۱۰۴؛ (۳) دِہ خدا: لغت نامہ، تہران ۱۹۴۸ء، ص ۱۷۷۵؛ (۴) شرف نامہ اور دیگر مآخذ کے لیے قب سٹوری (Storey)، ص ۳۶۶-۳۶۹۔

(فرائی R. N. Frye)

---

* **اَلْاُرْدُن**: یَرْدُن؛ عبرانی تلفّظ: (ہا) ''یَرْدِین''، لیکن شمارہ ۷۰، یوسفیوس (Josephus)، پلینیوس (Pliny) اور دوسری تصانیف میں: Ἰορδάνης۔ اس لفظ کا اشتقاق معلوم نہیں، بلکہ بعض لوگ تو اسے مستعار لفظ سمجھتے ہیں (قب جزیرۂ اقریطش (Crete) کے ایک دریا کا نام Λαπδαῖος) صلیبی جنگوں کے بعد اس کے لیے الشریعۃ (الکبیرۃ)، یعنی ''(بڑا) گھاٹ'' کا نام استعمال ہونے لگا اور بدویوں میں اب تک بھی یہی نام عموماً رائج ہے۔

(۱) دریاے اردن تین دریاؤں کے ملنے سے بنتا ہے، یعنی الحَسْبانی، نہر لِدّان اور نہر بانیاس۔ مقامِ اتّصال سے ذرا آگے نکل کر یہ دریا ضلع حُوْل میں داخل ہو جاتا ہے اور بحرۃ الخَیط میں سے بہتا ہے (ڈالمن Dalman کے نزدیک بحیرۃ الحُوْل محض شمال کی طرف نرکل سے ڈھکی ہوئی ایک دلدل کا نام ہے)؛ جنوب کی طرف وادی اردن تیزی سے نیچی ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بحیرۂ طبریہ (Galilee Lake)، جس میں سے گزر کر دریاے اردن بہتا ہے (رک بہ مادّۂ طبریہ)، بحر روم کی سطح سے چھے سو بیاسی فٹ نیچی ہے۔ اس وادی کے اُس حصے کو جو جھیل کے جنوبی سرے سے شروع ہو کر بحرِ مُردار (Dead Sea) سے تین گھنٹے کی مسافت پر واقع ایک سطح مرتفع تک جاتا ہے الغُوْر کہتے ہیں۔ یہاں اس وادی کی کیفیت اس کے شمالی نصف حصّے سے مختلف ہو جاتی ہے، یعنی اب وہ سفید برّاق زرخیز مٹی کے میدان کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جس کے درمیان میں سے دریا کئی بل کھاتا ہوا گزرتا ہے؛ چنانچہ اگر کوئی دریا کو کچھ بلندی سے دیکھے تو معلوم ہوتا ہے کہ سبز رنگ کا مڑا تڑا فیتا پڑا ہے، کیونکہ دریا کے کناروں پر گھنا سبزہ زار ہے، جس نے دریا کو ڈھک رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس میدان میں کہیں ہریاول کا نام و نشان نہیں، البتہ اس کے مغربی سرے پر پہاڑیوں کے دامن میں چند سرسبز نخلستان (حدائق الاردن) ہیں (قب الطبری: *Annales* [تاریخ]، ۱: ۱۲۳۲؛ دیکھیے مادّۂ رِیحَہ)۔ اردن بحرِ لوط (بحرِ مردار) میں جا کر ختم ہو جاتا ہے، جس کی سطح سطحِ سمندر سے ایک ہزار دو سو بانوے فٹ نیچی ہے اور زیادہ سے زیادہ گہرائی دو ہزار چھ سو فٹ ہے۔ مغرب یا جنوب کی جانب اس میں سے پانی نکلنے کا کوئی راستہ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ دریاے اردن کے ذریعے اس میں روزانہ ایک ارب تیس کروڑ گیلن پانی گرتا ہے، لیکن گرمی اس شدت کی ہوتی ہے کہ وہ سب کا سب بخارات بن کر اڑ جاتا ہے اور اس طرح پانی کی سطح، چھوٹے موٹے موسمی تغیّرات کے سوا، تقریباً یکساں ہی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس جھیل میں کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی، کیونکہ نمک اور دیگر معدنی اجزا جوں کے توں رہتے ہیں اور پانی اُڑ جاتا ہے۔ بحرِ مردار کے جنوب میں جو نشیب ہے اسے اَلْعَرَبہ کہتے ہیں؛ یہاں زمین پہلے تو خاصی بلند ہو جاتی ہے، لیکن اس کے بعد پھر خلیجِ عَقَبہ کی سطح کے برابر نیچی ہو جاتی ہے۔

یہاں دریاے اردن کے حسبِ ذیل معاون دریاؤں کا ذکر کیا جا سکتا ہے: جو نہیں یہ دریا بحیرۂ طبریہ سے نکلتا ہے تو بائیں کنارے پر اس میں الشریعۃ الصَّغیرَۃ یا الشریعۃ المناضِرۃ کا اہمّ دریا آ گرتا ہے، جسے پہلے یرموک [رک بآں] کہتے تھے؛ پھر مزید جنوب کی طرف نہر الزِّرقاء (قدیم جَبّوق Jabbok) الدّامِیَہ کے مقام پر آ ملتا ہے۔ دائیں کنارے کی طرف سے دریاے جالوت آتا ہے، جو عین جالوت سے نکلتا ہے اور بیْسان کے پاس سے بہتا ہُوا اردن میں آ گرتا ہے۔

یہ دریا اپنے بہاؤ کی تیزی، متعدد پیچ وخم اور جگہ جگہ گہرائی کی کمی کی بنا پر جہاز رانی کے لیے استعمال نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جہاں جہاں پانی کم گہرا ہے وہاں کئی جگہ قدیم زمانے میں بھی پایاب راستے تھے اور انھیں کے ذریعے اردن کے مشرق اور مغرب کے علاقوں میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح بحیرۂ روم کے ساحل اور مصر کا رابطہ دمشق سے قائم تھا۔ بحیرۂ طبریہ کے شمال میں ایسی پانچ گزرگاہیں یا پایاب راستے ہیں اور اس کے جنوب میں چَوْن؛ یہ زیادہ تر بیسان کے بالمقابل واقع ہیں۔ عہد نامۂ قدیم (تورات) میں ان کا ذکر معبر یا مَعْبَرہ کے نام سے آیا ہے۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس آر پار لے جانے والی کشتیاں تھیں یا نہیں اور کم از کم کتاب صموئیل الثانی، ۱۹:۱۹، کی مبہم عبارت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ دوسری طرف یہ باور کرنا بھی مشکل ہے کہ جب ان لوگوں نے اردن پار کر کے آرامیوں کے خلاف مشرقی علاقے میں جنگ کی تو اپنی فوجیں، گھوڑے اور رتھیں وغیرہ (کتاب الملوک الاوّل، ۲۲:۳۵) ان پایاب راستوں میں سے گزار کر لے گئے ہوں گے، کیونکہ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا کہ کس طرح گزار کر لے گئے (کیا بیڑوں یا تختوں (Floats) کے ذریعے؟)۔ ضرورت کے وقت اردن کو تیر کر پار کر لینا بھی ممکن تھا (المکابیم الاوّل، ۹:۴۸)، لیکن بہاؤ کی تیزی کی وجہ سے اس کے لیے بڑی مہارت اور قوت درکار تھی۔ اس وقت پل یقیناً نہیں تھے، کیونکہ ان کی تعمیر رومن حکومت کے زمانے میں شروع ہوئی۔ وہ گزرگاہ جو ضلع الجُوْلَہ سے ذرا جنوب کی طرف ہے بالخصوص مشہور ہے؛ وہاں سے قُنَیْطرہ ہوتی ہوئی ایک سڑک دمشق جاتی تھی۔ آیا یہاں کوئی سڑک رومنوں کے عہد کی تھی یا نہیں، اس کے متعلق پی تھامسن (P. Thomsen) کے نقشے مندرجۂ *ZDPV*، ۴۰ (قب ص ۳۳)، کی رُو سے کچھ یقین سے نہیں کہا جا سکتا، لیکن ازمنۂ

وسطٰی میں اس گزرگاہ کا جسے (کتاب التکوین، ۳۲: ۲۲، کے حوالے سے غلط طور پر) ویڈم جیکوبی (Vadum Jacobi) کہا جاتا تھا، ذکر آتا ہے اور صلیبی جنگوں کے دوران میں اس کی فوجی نقطۂ نگاہ سے خاصی اہمیّت رہی۔ یہیں ۱۱۵۷ء میں بالڈوِن سوم (Baldwin III) نے سلطان نور الدّین کے ہاتھوں شکست کھائی تھی اور ۱۱۷۸ء میں بالڈوِن چہارم نے مَعْبر سے ذرا نیچے کی طرف ایک قلعہ تعمیر کیا، جسے اگلے سال سلطان صلاح الدّین نے حملہ کرکے تباہ کر دیا۔ اس مَعْبر کے قریب بعد میں تین محرابوں کا ایک پل سنگِ سیاہ (basalt) کی بڑی بڑی سِلوں سے بنایا گیا (قب تصاویر، در *ZDPV*، ۱۳: ۷۴)۔ ۱۴۵۰ء تک اس پل کی موجودگی کا علم ہے اور غالبًا وہ اس سے کچھ ہی پہلے تعمیر کیا گیا ہوگا۔ اس کے نام 'جسر بنات یعقوب' میں قدیم نام وَیڈَم جَیکوبی (Vadum Jacobi) کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، لیکن یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ [حضرت] یعقوب[ؑ] کی متعدد بیٹیاں نہ تھیں۔

دمشق اور اردن کے مغربی علاقوں کو ملانے والے راستوں میں سب سے اہم راستہ غالبًا ہمیشہ وہ رہا ہے جو فِیق (یا اَفِیق، بلکہ اَفِق (Aphek)، الملوک الاوّل، ۲۰: ۲۶ - ۳۰؛ قب ۱۳: ۲۲) سے ہوتا ہوا بحیرۂ طبریہ کے جنوبی سرے تک جاتا ہے، جہاں جھیل سے نکلنے کے بعد اردن کو ایک مَعْبر کے ذریعے پار کیا جاتا تھا۔ اس مَعْبر سے ذرا جنوب کی طرف پتھر کے دو پلوں، یعنی اُمّ القناطر اور جِسر السِّد، کے شکستہ آثار ہیں۔ ان پلوں کی تاریخ تعمیر وغیرہ کا کچھ پتا نہیں چلتا، لیکن اُن میں سے ایک پل غالبًا وہی ہے جس کا ذکر المقدسی نے جھیل کے جنوب کی طرف طبریہ کے بیان میں کیا ہے اور جس کے متعلّق یاقوت نے یہ لکھا ہے کہ اس کی بیس محرابیں تھیں۔ چودھویں صدی جیسے مؤخّر زمانے میں بھی ہمیں بالڈِنسِل (W. de Baldensel) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اردن کو اس جگہ ایک پل کے ذریعے پار کیا تھا (رابنسن (Robinson): *Biblical Researches in Palestine*، بار دوم، ج ۳)۔ دریاے یَرْموک اور اردن کے مقامِ اتصال کے قریب جِسر المُجامِع نامی ایک پل ہے، جہاں سے بعض سڑکیں قَرْن صَرْطَبہ کی پہاڑیوں کے دامن میں سے ہوتی ہوئی مُقَیس اور اِرْبِد کو جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ جنوب کی طرف ایک اَور پل جِسر الدّامِیَہ کے نام سے ملتا ہے، جو اب خشک زمین پر ہے، کیونکہ یہاں دریا نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔ یہ پل زبردست مملوک سلطان بَیْبَرْس نے ۱۲۶۶ء میں بنایا تھا، جس نے اَور بھی متعدد مقامات پر پل تعمیر کرائے تھے (قب Röhricht: *Archives de l'Orient Latin*، ۱/۲: ۳۸۲؛ Clermont Ganneau، در *JA*، سلسلہ ۸، ج ۱۰ [۱۸۸۷ء]، ص ۵۱۸)۔

سب سے زیادہ مستعمل پلوں میں سے ایک وہ ہے جو اَرِیحا (Jericho) کے شمال میں ہے اور مغربی غَوْرین کو جاتا ہے۔

عرب جغرافیہ نگاروں نے اردن کے جو مختصر حالات لکھے ہیں ان میں بعض جزئیات دلچسپ ہیں۔ المقدسی کہتا ہے کہ یہ دریا جہاز رانی کے قابل نہیں ہے۔ یاقوت نے ایک قدیم تر ماخذ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اردن کو بحیرۂ طبریہ کے اوپر (شمال میں) تو اردنِ کبیر کہا جاتا تھا اور اس جھیل اور بحرِ مردار کے درمیان اردنِ صغیر؛ لیکن اس بیان کی بنیاد غالبًا دریاے یرموک سے التباس پر ہے (دیکھیے اوپر)۔ اس نے گنّے کے کھیتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو اَلْغَوْر (رکّ بہ مادّۂ ریحا) کے علاقے میں تھے اور ان کی آب پاشی اس دریا سے ہوتی تھی۔ الدمشقی نے بحر طبریہ اور جسر مُجامِع کے قریب، جہاں یرموک اردن سے ملتا ہے، پانی کے گرم چشموں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے اس دریا کے اختتام کی جگہ پر بعض عجیب و غریب مظاہر کا بیان بھی لکھا ہے۔ دریاے اردن رات دن بحرِ مُردار میں متواتر گِرتا رہتا ہے اور وہاں سے کوئی دوسرا نکاس بھی نہیں، اس کے باوجود بحرِ مردار کا پانی نہ جاڑوں میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ گرمیوں میں کم۔ دمشق سے جو شاہراہ مصر کو جاتی ہے وہ ابن خُرّداذبہ اور اس کا اتّباع کرنے والے جغرافیہ نویسوں (*BGA*، ۶: ۲۱۹) کے قول کے مطابق فِیق ہوتی ہوئی بحیرۂ طبریہ کے جنوبی کنارے تک جاتی ہے اور وہاں سے چکر کاٹتے ہوئے طبریہ کے راستے بَیْسان چلی جاتی ہے، لیکن اس کے برعکس چودھویں صدی عیسوی میں یہ شاہراہ عَجْلُوْن کے ایک حصّے سے گزرتی ہوئی بَیْسان سے وادی اردن میں اترتی تھی اور مجامع تک جاتی تھی اور پھر وہاں سے پل پار کرکے اَرْبِد کے راستے پر ہو لیتی تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں ایک اَور شمالی راستہ استعمال ہونے لگا، جو نئے دارالحکومت صَفَت (دیکھیے نیچے) سے مشرق کی طرف چل کر مذکورۂ بالا جسر بناتِ یعقوب کے ذریعے اردن کو پار کرکے نُعْران اور قُنَیْطِرہ ہوتے ہوئے دمشق جاتا تھا۔ اسی راستے پر عمومًا آمد و رفت ہوتی رہی ہے اور حال ہی میں پل کی طرف جانے اور وہاں سے آنے والی سڑک کو درست کرکے اُسے زیادہ آرام دہ بنا دیا گیا ہے۔

(۲) عربوں کا صوبۂ اردن ــ جُنْدُ الْاُرْدُن (اردن کا فوجی ضلع) ــ وہی تھا جو قدیم تر ملکی تقسیم میں "Palaestina Secunda" کہلاتا تھا اور اس میں جلیلَیْن (two Galilees)، وادی اُرْدن اور شرق اُردن کا مغربی حصّہ شامل تھے۔ اس کے بہت سے شہروں کو [حضرت] ابوعبیدہ[رض] نے ۱۴ھ/ ۶۳۵ء میں فتح کیا تھا۔ باقی علاقے [حضرت] خالد[رض] اور [حضرت] عمرو بن العاص[رض] نے فتح کیے۔ بعض لوگ ان علاقوں کا فاتح [حضرت] شُرَحْبِیْل[رض] کو بتاتے ہیں۔ یہ سب علاقے بزورِ شمشیر فتح کیے گئے تھے، سواے طبریہ کے، جہاں کے لوگوں نے بلا مقابلہ ہتھیار ڈال دیے تھے۔ غالبًا اسی وجہ سے سَکِی تھوپُولِس (Skythopolis) کے بجاے طبریہ ہی کو دارالحکومت بنایا گیا۔ ضلع کی وسعت کا اندازہ یہاں کے شہروں کی اس فہرست سے کیا جا سکتا ہے جو مؤرخوں اور جغرافیہ نگاروں نے دی ہے۔ بقول البلاذری یہ شہر مندرجۂ ذیل تھے: طبریہ، بَیْسان، قَدَس، عکّہ، صُوْر اور صَفُّوریہ اور شرق اردن میں سُوْسِیہ، اَفِیق، جَرَش، بَیْت راس، الجَوْلان اور سواد (؟)؛ بقول الیعقوبی: طبریہ، صور، عکّہ، قدَس، بیسان اور شرق اردن میں فَحْل، جَرَش اور سواد (؟)؛ بقول ابن الفقیہ: طبریہ، السّامرہ (یعنی نابُلُس)، بیسان، عکّہ،

قدس اور صُور اور شرق اُردن میں فِحْل اور جرش؛ بقول المقدسی: طبریہ، قدس، فَرَذِیَہ، عکّہ، اللَّجُّوْن، کبُوْل اور بَیْسان اور شرق اردن میں اَذْرَعات؛ بقول الادریسی: طبریہ، اللَّجُّون، السّامرہ (نابلس)، بیسان، اَرِیْحا (Jericho)، عکّہ، ناصرہ، صُور اور شرق اردن میں زُغار، عَمّتا (Amathus)، ہَبِیس (یابس؟) جَدَر، آیْلِ (اَیلہ)، سُوسیہ؛ بقول یاقوت: طبریہ، بیسان، صفّوریہ، صُور اور عکّہ اور شرق اردن میں بیت راس اور جدر وغیرہ۔ ان فہرستوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود ہمیشہ یکساں نہیں رہیں.

صوبۂ اردن کے سالانہ خراج کے متعلق عرب مصنّفوں نے حسبِ ذیل اعداد و شمار دیے ہیں (قبّ فلسطین): آٹھویں صدی عیسوی کے آخر میں چھیانوے ہزار دینار، المأمون کے عہد میں ستانوے ہزار، ابن خُرّداذبہ اور ابن الفقیہ کے بیان کی رُو سے تین لاکھ پچاس ہزار، بقول قُدامہ ایک لاکھ نو ہزار، الیعقوبی ایک لاکھ اور المقدسی ایک لاکھ ستر ہزار (دیکھیے ZDPV، ۷: ۲۲۵).

حروبِ صلیبیہ کے زمانے میں اضلاع کی پرانی تقسیم ختم کر دی گئی اور بجاے ان کے سلطان صلاح الدّین کے خاندان کے افراد نے مختلف سلطنتیں (مملکات) قائم کر لیں۔ صوبۂ اردن بیشتر مملکت صَفَت پر مشتمل ہے اور اس نام کے شہر کے علاوہ اس میں حسبِ ذیل اضلاع شامل تھے: مَرْج، عَیُوْن، لَجُّوْن، جنِین، عکّہ، صُور اور صَیْدا، یعنی وہ تمام شہر جو دریاے اردن کے مغرب میں ہیں.

شہاب الدّین المقدسی نے ۱۳۵۱ء میں ایک کتاب المُثِیر لکھی تھی، جس سے اکثر اَور لوگ نقل کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں ہمیں ایک اَور صوبے کا ذکر ملتا ہے جس میں اَلْغَوْر اور دریاے اردن کے مشرق کے علاقے زیادہ نمایاں ہیں، یعنی الحَوْران، جس کا مرکزی مقام طبریہ تھا اور جس میں الغور، یَرْمُوک اور بَیْسان کے اضلاع شامل تھے.

مآخذ: (۱) سمتھ (G. A. Smith): *Historical Geography of the Holy Land*، طبع پانزدہم، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۲) Schwöbel: *Die Landesmatur Palästinas*، ج ۱، ۱۹۱۴ء: ص ۴۵ بعد؛ (۳) المَقدِسی، در *BGA*، ۳: ۱۹، ۱۶۱، ۱۸۴؛ (۴) الادریسی، در *ZDPV*، ۸: ۱۲۰ (متن، ص ۳)؛ (۵) یاقوت: معجم، ۱: ۲۰۰؛ (۶) الدمشقی، طبع مہرن (Mehren)، ص ۱۰۷؛ (۷) ابوالفداء، طبع Reinaud و de Slane، ص ۴۸؛ (۸) Robinson: *Biblical Researches in Palestine*، ج ۳؛ (۹) Schumacher: *Der Dscholan*، در *ZDPV*، ۹: ۱۶۵ بعد، خصوصاً ص ۲۱۶؛ (۱۰) وہی مصنّف: *Der südliche Basan*، در مجلۂ مذکور، ۲۰: ۶۵ بعد؛ (۱۱) Röhricht: *Geschichte des Königreiches Jerusalem*، ص ۲۸۹، ۳۸۲ بعد، ۳۸۶ بعد؛ (۱۲) R. Hartmann: *Die Strasse von Damaskus nach Kairo*، در *ZDMG*، ۶۴: ۶۶۵ بعد؛ Via Maris کی تاریخ پر؛ (۱۳) *ZDPV*، ۴۱: ۵۳ بعد؛ (۱۴) البلاذری، طبع دخویہ (De Goeje)، ص ۱۱۵ بعد، ۱۲۶، ۱۳۱؛ (۱۵) الطبری، طبع دخویہ، ۱: ۲۰۹۰، ۲۱۰۸؛ (۱۶) الیعقوبی، در *BGA*، ۷: ۳۲۷ بعد؛ (۱۷) ابن الفَقِیہ، در *BGA*، ۵: ۱۱۶، ۲۲۶؛ (۱۸) المقدسی، در *BGA*، ۳: ۱۵۴، ۱۸۹؛ (۱۹) الادریسی، در *ZDPV*، ۸: ۱۳۹ (متن، ص ۲۱)؛ (۲۰) یاقوت: معجم، طبع وُسٹِنْفِلْٹ (Wüstenfeld)، ۱: ۲۰۱؛ (۲۱) ابن خُرّداذبہ، در *BGA*، ۶: ۷۸، ۲۴۶؛ (۲۲) R. Hartmann: *Palästina unter dem Arabern*، ص ۱۴، ۱۶.

(بوہل: FR. BUHL)

⊗ **اُردو**: مسلمانوں کی آمد نے بَرِّعظیم پاک و ہند کو بے شمار فوائد پہنچائے، جن سے اہلِ ملک کی زندگی اور خیالات میں نیا انقلاب پیدا ہو گیا، لیکن ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہمّ اور عظیم الشّان کارنامہ وہ مشترک اور مقبولِ عام زبان ہے جو اس برِّعظیم کو، جس میں بیسیوں زبانیں اور سینکڑوں بولیاں رائج ہیں، گزشتہ ہزارہا سال سے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی.

مسلمانوں کی آمد پہلے سندھ میں ہوئی، جب کہ محمد بن قاسمؒ نے پہلی صدی ہجری کے اواخر (۹۳ھ/۷۱۱ء) میں اس علاقے کو فتح کیا۔ مسلمانوں کا تسلّط اس علاقے میں مدّتِ دراز تک رہا۔ سندھ پر اسلام اور اسلامی تہذیب کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے اور سندھی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ غیر نہیں معلوم ہوتے [اور وہ عربی حروف ہی میں لکھی جاتی ہے].

دوسری صدی ہجری میں ہندوستان کی ایک دوسری سمت، یعنی جنوب میں عرب مسلمان تاجروں کی حیثیت سے پہنچے اور ملیبار کی تجارت کلیۃً ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ کالی کٹ ان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں مسلمان بلا شرکت غیرے زمانۂ دراز تک بحری تجارت کے مالک رہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار موپلا (ماپلا) قوم اب بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔ عرب تاجروں نے نومسلموں کو عربی سکھائی اور خود ملیالم سیکھی، جسے وہ عربی خط میں لکھتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملیالم زبان میں کثرت سے عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جنوبی ہند سے مسلمانوں کا یہ تعلّق [زیادہ تر] تجارتی تھا.

سندھ کے بعد کوئی تین سو برس گزرنے پر شمالی ہند میں مسلمانوں کا دوسرا سیاسی تعلّق سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے ہوا۔ اس دَور کو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیّت حاصل ہے۔ گو سلطان محمود کے حملوں کے بعد مسعود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب کی حیثیت ایک صوبے کی سی رہی، تاہم اس ملک والوں سے فاتحوں کے تعلّقات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے؛ چنانچہ ہندوؤں کی ایک خاص فوج غزنی میں متعیّن تھی، ہندی فوج کا کماندار سویندرائے تھا اور جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو مسعود نے اُس ممتاز عہدے پر تلک کا تقرّر کیا.

پنجاب میں غزنوی حکومت تخمیناً پونے دو سو برس تک رہی۔ اس عرصے میں ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلّقات خاصے وسیع ہو گئے۔ اکثر ہندوؤں نے فارسی

پڑھی اور مسلمانوں نے ہندی۔محمود کے زمانے میں غزنی میں متعدد ترجمان تھے، جن میں سے تلک اور بہرام کے نام تاریخوں میں آتے ہیں۔ اس زمانے کے بعض نامور اور مستند شعرا کے کلام میں بھی بعض ہندی الفاظ داخل ہو گئے۔ مسعود بن سعد بن سلمان کی نسبت محمد عوفی، مصنّف لباب الالباب، نے لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ اس کا تیسرا دیوان ہندی میں بھی تھا (تذکرۂ لباب الالباب، ج ۲، باب ۱۰)۔ امیر خسروؒ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (دیباچۂ غرۃ الکمال)، لیکن اُن کے ہندی کلام کا اب تک کہیں پتا نہیں لگا۔ یہ کون سی ہندی تھی اور کس قسم کی زبان تھی؟ اس کا مطلق علم نہیں۔ محمود کی وفات کے کچھ عرصے بعد غزنوی حکومت کی وہ شان نہ رہی۔ غوریوں سے جو لڑائیاں ہوئیں انھوں نے حکومت کو کمزور کر دیا۔ آخر ۵۸۳ھ/ ۱۱۸۷-۱۱۸۸ء میں علاء الدّین کے بھتیجے معز الدّین بن سام نے، جو محمد غوری کے نام سے مشہور ہے، محمود کے آخری جانشین کو تخت سے اتار دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ محمد غوری نے ہندوستان میں دُور دُور دھاوے مارے اور فتوحات حاصل کیں، مگر محمود اور اس کے جانشینوں کی طرح اس کا دل بھی غزنی میں تھا اور محمود کی طرح اسے بھی ہندوستان میں رہ کر سلطنت قائم کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ سلطان تراین کی فتح کے بعد واپس چلا گیا اور ہندوستان کے تمام معاملات اور معرکے اپنے معتمد جنرل اور نائب قطب الدّین ایبک کے حوالے کر گیا۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۶۰۳ھ/ ۱۲۰۶ء میں قطب الدّین ایبک، جو ایک زرخرید غلام تھا، ہندوستان کے مفتوحہ علاقے کا فرمانروا قرار پایا۔ ہندوستان میں اب پہلی بار ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی، جس کا پہلا سلطان قطب الدّین تھا، جو خاندانِ غلامان کا بانی ہوا۔

اب ہندوستان میں ایک نئی قوم آتی ہے اور یہیں بس جاتی ہے۔ اس کا مذہب اور اس کی تہذیب، اس کی زبان اور رسم و رواج اور عادات و خصائل ان لوگوں سے جدا ہیں جو پہلے سے آباد ہیں۔ اب یہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت کی رعایا ہو جاتے ہیں۔ وہ تعلّقات جو پہلے عارضی اور ادھورے تھے، اب مستقل اور پختہ ہو گئے۔ کاروبارِ ملکی و معاشرتی اور ضروریاتِ زندگی نے انھیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور قربت کی بدولت ایک کی تہذیب و زبان کا اثر دوسرے کی تہذیب و زبان پر تیزی سے پڑنے لگا۔

مسلمان جس وقت یہاں آئے تو اس ملک کی، جسے ہندوستان کہتے تھے، عجب کیفیت تھی۔ جس طرح ملک مختلف رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر علاقے کی حکومت الگ تھی اسی طرح ہر علاقے کی زبان بھی جُدا تھی۔ یہاں اُن بولیوں اور ان کی اصل کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کی آمد کے وقت رائج تھیں۔ آریاؤں کا اصل وطن کہاں تھا؟ اس کے متعلّق مختلف اور متضاد نظریات ہیں اور اب تک قطعی طور پر اس کا فیصلہ نہیں ہوا، لیکن یہ قرینِ یقین ہے کہ جو آریا ایران میں آ بسے تھے ان کا ایک گروہ مشرقی جانب کوچ کرتا ہوا وسط ایشیا سے بَرِّعظیم پاک و ہند میں داخل ہوا۔ یہاں آ کر انھیں یہاں کے دیسی باشندوں، یعنی دراوڑی قوم سے سابقہ پڑا۔ یہ آریا غیر متمدّن تھے اور اُن کی حالت خانہ بدوشوں کی سی تھی، اُن کے مقابلے میں دراوڑی زیادہ ترقی یافتہ اور متمدّن تھے۔ آریا جسمانی لحاظ سے قوی تھے۔ انھوں نے دراوڑوں کو ان کے زرخیز علاقوں سے مار بھگایا اور جو باقی بچے انھیں غلام بنا لیا؛ چنانچہ ان ''بہادر اور شریف'' آریاؤں کی یادگار وہ کروڑوں شودر اور اچھوت ہیں جو اس بَرِّعظیم میں اب تک اپنے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جب دو ایسی قومیں آپس میں ملتی ہیں جن میں ایک متمدّن اور دوسری غیر متمدّن ہو تو جو تہذیب اس ملاپ سے پیدا ہوتی ہے اس پر غالب اثر متمدّن قوم کا ہوتا ہے، خواہ وہ قوم مفتوح ہی کیوں نہ ہو۔ بنا بریں دراوڑی تہذیب کا اثر آریاؤں کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا، حتّٰی کہ وہ دراوڑیوں کے بعض دیوتاؤں کو بھی پوجنے لگے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیّت حاصل ہے۔ ان دو قوموں کی یک جائی سے، جن کی بولیاں مختلف تھیں، ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازم تھا۔ متمدّن قوم کی بولی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ آریاؤں اور دراوڑیوں کے میل جول سے جو بولی وجود میں آئی اس میں لامحالہ دراوڑی الفاظ کی بہتات تھی، کیونکہ متمدّن قوم کی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس میں اشیا کے ناموں اور خیالات و جذبات کے اظہار کے لیے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ غیر متمدّن بولی پر غالب آ جاتی ہے۔ دراوڑی بولی کا اثر صرف الفاظ ہی تک محدود نہ رہا اصوات بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ لسانیات کا یہ گوشہ ابھی تحقیق کی روشنی سے محروم ہے، لیکن اس میں شُبہہ نہیں کہ اسی پراکرت سے وہ زبان نکلی جو سنسکرت کہلاتی ہے؛ نیز یہی بولی ان قدیم پراکرتوں اور بولیوں کی ماں ہے جو اس بَرِّعظیم میں بولی جاتی ہیں اور اسی کے اثر سے اس زبان نے جو آریا ایران سے بولتے آئے تھے ہند-آریائی شکل اختیار کی۔

پراکرت کے معنی فطری، غیر مصنوعی کے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سنسکرت سے مراد شُستہ، مصنوعی زبان ہے۔ سنسکرت برہمنوں کے تشدد اور نحویوں کے اصول و ضوابط کے قیود اور جکڑ بندی سے بانجھ ہو کر رہ گئی، عام بول چال کی زبان نہ ہونے پائی اور برہمنوں اور اہلِ علم کے طبقے تک محدود رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پراکرتوں کو، جو عوام کی بولیاں تھیں، خاطر خواہ فروغ ہوا اور ان پراکرتوں سے دوسری بولیاں نکلیں اور پھولی پھلیں۔ انھیں بولیوں میں سے ماگدھی اور اودھ-ماگدھی ہیں، جو مہاتما بدھ اور جین مذہب کے بانی مہاویر نے اپنے مذہبی عقائد کی تلقین کے لیے اختیار کیں۔ انھیں بولیوں نے بعد میں کسی قدر تغیّر سے پالی اور جینی اودھ-ماگدھی کی شکل اختیار کی۔ جب یہ زبانیں بھی سنسکرت کی طرح ٹھیٹ ادبی اور مذہبی بن جانے پر ویسی ہی قواعد اور ضوابط کی پابند ہو گئیں اور بول چال کی زبانیں نہ رہیں تو اس وقت پراکرت کی بول چال کی زبان اپ بھرنشا (بگڑی زبان) نے ان کی جگہ لے لی۔

بارھویں صدی میں متعدد اپ بھرنشائیں تھیں۔ سورسینی (شورسین دیس، متھرا) کی اپ بھرنشا وسطی علاقے کی بولیوں کی ماں ہے۔ ان میں سے ایک اُس علاقے میں بولی جاتی تھی جو ستلج کے کنارے سے دہلی تک اور روہیل کھنڈ کی مغربی حدود تک پھیلا ہوا ہے اور ایک (یعنی برج بھاشا) آگرے اور متھرا کے علاقے میں اور بندھیل کھنڈ میں۔ مشرق کی جانب دوسری بولیاں مروّج تھیں، مثلاً میتھلی، ماگدھی، بھوج پوری وغیرہ اور آگے بنگالی، آسامی، اڑیا؛ مغرب کی جانب راجستھانی اور گجراتی؛ جنوب کی طرف مرہٹی اور تامل؛ مغرب میں پنجابی۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس حصّۂ مُلک میں یہ سب بول چال کی بولیاں تھیں۔ ان بولیوں کا سنسکرت سے براہِ راست کوئی تعلّق نہ تھا، بجز اس کے کہ ان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ ـــــ کچھ اصلی صورت میں اور زیادہ تر مسخ شدہ حالت میں ـــــ ضرور پائے جاتے تھے۔

دلّی، میرٹھ اور آس پاس کے مقامات میں جو بولی مروّج تھی وہ وہی تھی جسے امیر خسروؒ دہلوی (یا ہندوی) کہتے ہیں (مثنوی نہ سپہر)۔ ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ عوام کی بولی تھی اور غالبًا یہی وجہ ہے کہ اسے اس زمانے میں کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور سلطنت کو استقلال ہوا تو یہی بولی تھی جو وہاں بولی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس پر آس پاس کی بولیوں (پنجابی، ہریانی وغیرہ) کا بھی اثر پڑا۔

جو مسلمان ہندوستان میں آئے ان کی مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ اس کا بول چال سے تعلّق تھا نہ روزمرّہ کی ضروریات سے۔ ترکی امرا اور شاہی خاندان والوں تک محدود تھی۔ دفتری، کاروباری، درباری، تہذیبی اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ اس کی قلم دہلوی زبان پر لگی تو اس پیوند سے ایک نئی مخلوط بولی وجود میں آئی۔ ابتدا میں یہ ہندی یا ہندوی کہلاتی رہی۔ بعد میں دوسری بولیوں سے امتیاز کے لیے اسے ریختہ کا نیا نام دیا گیا، جس سے مراد ملی جلی زبان ہے۔ ابتدا میں لفظ ریختہ صرف کلامِ منظوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں عام زبان کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ہندوستانی (یعنی زبانِ ہندوستان) بھی اسی کا دوسرا نام ہے۔ یہی بولی رفتہ رفتہ اس رتبے کو پہنچی جسے ہم ''اردو'' کہتے ہیں اور جو اَب مقبولِ عام نام ہے۔ عالمگیر کے عہد سے قبل یہ نام زبان کے لیے کسی تحریر میں نظر نہیں آتا۔

یہ زبان، جس کے لیے زمین پنجاب کے میدانوں میں تیار ہوئی اور جس نے دلّی میں خاص حالات میں ایک نئی بولی کا روپ دھارا، صوفیوں، درویشوں اور سلطنتِ دہلی کے لشکروں کی بدولت گجرات، دکن، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔

درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا ہوتا ہے۔ بلا امتیاز ہر قوم وملّت کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی زیارت وصحبت کو مُوجبِ برکت سمجھتے ہیں۔ عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ خواص سے زیادہ عوام درویشوں کی طرف جھکتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے اصول وعقائد کی تلقین کے لیے جو ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدّم یہ تھا کہ جہاں جائیں اس خطّے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق فاضل شارحِ اکھروتی (تصنیف ملک محمد جائسی) کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں: -

''وتوھم نکند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلّم نہ کردہ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ۔ پس ہر در ملک کہ بودہ زبان آن ملک را بکار بردہ اند و گمان نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلّم نہ کردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملّت والدّین قدس سرہٗ بدین زبان سخن فرمودہ، بعدازاں خواجہ گنج شکر قدس سرہٗ؛ و حضرت خواجہ گنج شکر در زبان ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ... ہمچنان ہر یکے از اولیاء اللہ بدین لسان تکلّم فرمودند۔''

حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ العزیز کا کوئی ہندی قول اب تک نہیں ملا، لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ قرینِ یقین ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے۔ البتہ شیخ فرید الدین شکر گنج قدس سرہٗ (۵۶۱ھ/ ۱۱۷۳[؟۱۱۶۵]ء - ۶۶۴ھ/ ۱۲۶۵ء) کے بعض مقولے ملتے ہیں۔ مولانا سیّد مبارک، معروف بہ میر خورد، جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید و مصاحبِ خاص تھے، اپنی تالیف سِیَر الاولیاء میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت نے شیخ جمال الدینؒ کے چھوٹے بیٹے کو اپنی بیعت سے مشرّف کیا اور رخصت کے وقت خلافت نامہ، مصلّی اور عصا عنایت فرمایا تو ''مادرِ مؤمنان'' (شیخ جمال الدینؒ کی خادمہ) نے کہا ''خوجا بالا ہے''، اس پر انھوں نے ہندی زبان ہی میں فرمایا ''پونوں کا چاند بھی بالا ہے''، یعنی ہلال بھی پہلی رات کو چھوٹا ہوتا ہے۔

شیخ بہاء الدین باجنؒ (۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء - ۹۱۲ھ/ ۱۵۰۶ء) نے اپنی تصنیف خزائن رحمت میں حضرت شکر گنجؒ کے یہ دو قول نقل فرمائے ہیں، جو ہماری رائے میں مستند معلوم ہوتے ہیں:

(۱) راول دیول ہمی نہ جائے
پھاٹا پہنہ رُوکھا کھائے
ہم درویشنہہ رہے ریت
پالی لورین اور مسیت

(۲) جس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس۔ جمیعات شاھی میں، جو حضرت قطب عالمؒ (۷۹۰ھ/ ۱۳۸۸ء - ۸۵۰ھ/ ۱۴۴۶ء) اور حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، حضرت خواجہ شکر گنجؒ کا یہ منظوم قول نقل کیا ہے:

اسا کیری یہی سو ریت
جاون نائے کی جاون مسیت

یوں بہت سے منظوم اقوال ان کے نام سے مشہور ہیں، لیکن ان کی کوئی باوثوق سند نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ان کے ہم نام بابا فریدؒ کے ہیں۔

شیخ بوعلی قلندرؒ (م ۷۲۴ھ/ ۱۳۲۳ء) کا امیر خسروؒ سے یہ کہنا ''ترکا کچھ سمجھدا ہے'' ثابت کرتا ہے کہ یہ بزرگ بھی مقامی زبان سے واقف تھے۔

اسلامی ہند کے صاحبِ کمال شاعر و ادیب امیر خسروؒ (۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء۔ ۷۲۵ھ/ ۱۳۲۵ء) پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ اور جملے بے تکلف استعمال کیے۔ ان کی نسبت عام طور پر یہ یقین ہے کہ ان کا کلام ہندی میں بھی تھا اور بعض تذکروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ خود امیرؒ نے بھی اپنے دیوان غرۃ الکمال [کے دیباچے] میں صاف طور پر لکھا ہے کہ میں نے ہندی نظم بھی کہی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ریختہ قسم کے بعض قطعے یا ایک آدھ غزل اور کچھ پہیلیاں، چیستانیں، کہہ مکرنیاں، انملیاں، دوسخنے یا دوہے، جو اُن سے منسوب ہیں، ان کی صحت کے جانچنے کا اس وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ ان میں سے ممکن ہے بعض ان کے ہوں، لیکن صدہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ اور زبان میں کچھ تغیر آ گیا ہے۔ سب سے قدیم حوالہ ملّا وجہی کی تصنیف سب رس (۱۰۴۵ھ) میں ملتا ہے۔ اس میں ان کا یہ دوہا نقل کیا گیا ہے:

پنکھا ہو کر میں ڈُلی، ساتی تیرا چاؤ
مجھ جلتی [کا] جنم گیا، تیرے لیکھن باؤ

(سب رس، مطبوعۂ انجمن ترقی اردو، ص ۲۰۳)

ان کی فارسی مثنویوں میں ہندی الفاظ اور جملے بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوے ہیں، مثلاً تغلق نامہ (ص ۱۲۸) میں: ''بزاری گفت ہے ہے تیر مارا''، خالص دہلوی زبان ہے۔

شیخ لطیف الدین دریا نوشؒ سلطان الاولیاء شیخ نظام الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حضرت شیخ باجنؒ اپنی تصنیف خزائنِ رحمت میں لکھتے ہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ شہر (دلّی) سے سِرکی لاتے اور اپنے رہنے کا گھر بنا لیتے۔ جب یہ سرکی پرانی ہو جاتی یا آندھیوں میں اُڑ جاتی تو دوسری سرکی لے آتے۔ ان سے جب یہ کہا گیا کہ آپ مستقل گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو فرمایا:

ارے ارے بابا ہمیں بنجارے
کیا گھر کرتے بینمارے

شیخ بہاء الدین باجنؒ نے اپنی اسی تصنیف خزائن رحمت میں اپنے مرشد شیخ رحمت اللہؒ کے ملفوظات و ارشادات اور اقوالِ مشائخِ سلف بھی جمع کیے ہیں۔ اس میں جگہ جگہ اپنے اشعار اور دوہے بھی لکھے ہیں۔ چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

(۱) ساجن دعا خدا اُس کی قبولے
کھاوے حلال اور ساچ بولے

قل ھواللہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

(۲) نا اُنہ جنیا نہ وہ جایا
نہ اُنہ مائی باپ کہلایا
نا اُنہ کوئی گودہ چڑھایا
باجن سب اُنہ آپ پتایا
پر گٹ ہوا ہر کہیں ڈیٹھیا آپ لُکایا

(۳) مسجد مسجد بانگا دیویں بت خانے تیرا شور
میخانے بھیتر رنگ کرے ایسا تیرا چور

(۴) باجن جَس وہ کرے کرم
پاپ بھی ہووے دھرم

(۵) یہ فتنی کیا کس ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

ان مثالوں سے ظاہر ہوا کہ جو زبان امیر خسروؒ کے وقت یا ان کے قریب کے زمانے میں دلّی میں بولی جاتی تھی وہ اس زبان سے جسے ہم اردو کہتے ہیں کس قدر قریب تھی۔ بعض جملے تو بالکل آج کل کی سی زبان میں ہیں۔

صوفیوں اور درویشوں کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اس زبان کے پھیلانے اور دور دراز علاقوں میں پہنچانے میں مدد دی وہ سلطنت کی فوجیں تھیں۔ صوفیوں کا مقصد اس زبان کی اشاعت نہ تھا۔ انھوں نے یہ زبان اس لیے اختیار کی کہ یہی ایک ایسی زبان تھی جس کے ذریعے وہ ملک کے ہر حصّے میں اپنے اصول و عقائد کی تلقین کر سکتے تھے؛ یہ اَور بات ہے کہ اس ضمن میں زبان کی بھی اشاعت ہو گئی۔ یہی صورت سلاطینِ دہلی کی فتوحات سے ظہور پذیر ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے ۶۹۵ھ/ ۱۲۹۶ء میں علاء الدین نے دکن پر لشکر کشی کی اور دیوگری تک جا پہنچا اور ۶۹۸ھ/ ۱۲۹۹ء میں گجرات پر تسلّط کر لیا اور اپنی طرف سے صوبے دار مقرر کر دیا۔

علاء الدین کے بعد ۷۲۷ھ/ ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے دلّی شہر کی آبادی کو دیوگری (دولت آباد) میں لے جا کر بسا دیا اور تخمیناً دو لاکھ دلّی والے دولت آباد میں آباد ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کی زبان جا پہنچی، جس کے آثار اب بھی دولت آباد اور خلد آباد میں پائے جاتے ہیں۔ اس حیرت انگیز واقعے نے اس زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔

اس زبان کو دو وجوہ سے ایک جداگانہ اور خاص حیثیت حاصل ہو گئی: ایک تو یہ کہ وہ شروع ہی سے فارسی حروف اور رسمِ خط میں لکھی جانے لگی؛ دوسرے یہ کہ اس نے تھوڑی مدّت بعد وہ عروض بھی اختیار کر لی جو فارسی زبان میں مروّج ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ زبان جس نے دلّی میں جنم لیا دکن میں جا کر ادب و انشا کا مرتبہ حاصل کرتی ہے اور وہاں اسے فروغ ہوتا ہے۔ بہمنی عہد ہی میں اس کا رواج ہو چلا تھا اور موزوں طبع لوگ اس سے کام لینے لگے تھے۔ اس عہد کی پہلی کتاب معراج العاشقین سمجھی جاتی ہے، جو حضرت سیّد محمد بن یوسف الحسینی

الدہلویؒ سے منسوب ہے۔ یہ شیخ نصیرالدینؒ چراغ دہلویؒ کے مرید تھے اور خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔ معراج العاشقین مَیں نے ہی حیدر آباد دکن سے شائع کی تھی۔ مجھے اس وقت بھی پورا یقین نہ تھا کہ یہ خواجہ بندہ نوازؒ کی تصنیف ہے۔ خواجہ بندہ نوازؒ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں۔ ان کی سب کتابیں فارسی یا عربی زبان میں ہیں۔ میں نے ان کی اکثر تصانیف اس خاص نظر سے بالاستیعاب دیکھی ہیں۔ کہیں کوئی ہندی لفظ یا جملہ نظر نہ پڑا۔ علاوہ معراج العاشقین کے مجھے اَور بھی کئی رسالے مثلاً تلاوت الوجود، دُرُّ الاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ وغیرہ ملے، جو قدیم اردو میں ہیں اور خواجہ صاحب سے منسوب ہیں۔ اخبار الاخیار، تصنیف شیخ عبدالحقؒ محدّث دہلوی اور جوامع الکلم، تالیف سیّد حسین المعروف بہ سیّد محمد اکبر حسینی فرزند اکبر خواجہ بندہ نوازؒ، جس میں حضرت کے ملفوظات وحالات کا تذکرہ ہے، اس میں کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ دکنی یا قدیم اردو میں بھی ان کی کوئی تصنیف ہے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ ان کے فارسی اور عربی رسالوں کے ترجمے ہیں، جو ان کے نام سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہماری زبانوں میں ہوتی آئی ہے۔ ان کا منظوم کلام بھی بعض بیاضوں میں پایا جاتا ہے۔ شہباز کا لفظ بھی ان کے نام کے ساتھ آیا ہے، اس لیے بعض منظوم اقوال، جن میں شہباز بطورِ تخلص استعمال ہوا ہے، انھیں کا کلام سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض مقالہ نگار نے اپنی کتاب اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا کام میں نقل کیے ہیں۔ سب سے قدیم حوالہ ان کے منظوم کلام کا ایک پرانی مستند بیاض میں ملا، جس میں میراں جی شمس العشّاقؒ اور ان کے بیٹے، پوتے اور بعض مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کا سنہ کتابت ۱۰۶۸ھ ہے۔ اس میں ان کی ایک غزل بھی ہے، جس کے مقطع میں شہباز حسینی آیا ہے۔ اس بنا پر اسے خواجہؒ کا کلام سمجھ لیا گیا؛ لیکن اس نام کے دو اور بزرگ گزرے ہیں: ایک ملک شرف الدین شہباز گجراتی (م ۹۳۴ھ) اور دوسرے بیجاپور کے شہباز حسینی (م ۱۰۱۸ھ)، اس لیے حتمی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خواجہ بندہ نوازؒ کا کلام ہے۔ زبان بھی اس کی بہت پرانی نہیں، البتہ اس بیاض میں مقام ''ابھنگ'' میں تین مصرعوں کا ایک مثلّث ان کے نام سے درج ہے، جو یہ ہے:

حضرت خواجہ نصیر الدین جنے جیو میں آئے
جیو کا گھونگھٹ کھول کر مکھ پاو دکھائے
آکھے سیّد محمد حسینی پیو کا سُکھ کھیانہ جائے

اس نظم میں ان کے اپنے پیرومرشد کا نام بھی ہے اور اس کے ساتھ اپنا پورا نام ہے، اس لیے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خواجہ صاحب کا کلام ہے۔ جوامع الکلم میں خود خواجہ صاحب کی زبانی ان کی متعدد غزلیں منقول ہیں۔ ان غزلوں میں وہ اپنا تخلّص محمد یا ابوالفتح یا بوالفتح لکھتے ہیں۔

اس وقت تک ہم نے قدیم زبان کے بول چال کے یا منظوم اقوال پیش کیے ہیں، کسی مستقل کتاب کا ذکر نہیں آیا۔ مستقل کتابیں ایک مدّت کے بعد تحریر میں آئیں۔ اگر معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے تو دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب مثنوی کدم راو و پدم راو ہے۔ مصنّف کا نام فخرالدین نظامی ہے، جس کا اظہار اس نے اس نظم میں کئی جگہ کیا ہے۔ صحیح سنہ تصنیف معلوم نہ ہوسکا، لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یہ کتاب سلطان علاء الدین شاہ بہمنی بن احمد شاہ ولی کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ نعت کے بعد ایک عنوان ہے: ''مدح سلطان علاء الدین بہمنی نوراللہ مرقدہٗ''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلطان علاء الدین کو مرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ سلطان علاء الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ میں تخت نشیں ہوا اور ۸۶۲ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کا فرزند اور جانشین ہمایوں شاہ تھا، جو ۸۶۵ھ میں فوت ہوگیا۔ ہمایوں کا جانشین اس کا فرزند نظام شاہ ہوا۔ اس کا دو سال بعد ۸۶۷ھ میں انتقال ہوگیا۔ مدحِ سلطان کے یہ اشعار قابلِ غور ہیں: ۔

شہنشہ برا شاہ احمد کنوار
پرتپال سینسار کرتار ادھار
دھنین تاج کا کون راجا ابھنگ
کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ

سلطان علاء الدین کی اولاد اور اس کے جانشینوں میں کسی کا نام احمد شاہ نہ تھا۔ بعض صاحبوں نے بہمنی سکّوں سے یہ پتا لگایا ہے کہ جو سکّے ۸۶۵ سے ۸۶۷ھ تک مضروب ہوے ہیں ان پر احمد شاہ کا نام ہے، اگر یہ صحیح ہے تو یہ مثنوی انھیں سنین میں تصنیف ہوئی ہے، بہرحال اس میں شُبہہ نہیں کہ سلطان علاء الدین شاہ کے انتقال کے بعد اس کے کسی جانشین کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ اس مثنوی کی زبان میں ہندی عنصر بہت زیادہ ہے۔ عربی فارسی لفظ کہیں کہیں آجاتے ہیں۔ چونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ نہیں، اس لیے دو چار شعر بطورِ نمونے کے درج کیے جاتے ہیں: ۔

حمد: گسائیں تہیں ایک دُنہ جگہ ادھار
بروبر دُنہ جگہ تہیں دینار
جہاں کچھ نکویے تہاں ہیں تُہیں
نعت: تُہیں ایک ساجا گسائیں امر
سری دوی تین جگ تورا دگر
امولک مُکت سیس سنسار کا
کرے کام سردھار کرتار کا

لیکن اس زبان کے ساتھ بعض مصرعے یا شعر ایسے صاف ہیں کہ وہ آج کل کی سی زبان کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً:

(۱) سیانا کھرا اتّ بدھ ونت توں
تجھ نا کہوں اور کس کوں کہوں

(۲) گنواوے کہیں اور ڈھونڈے کہیں
نہ پاوے کہیں ڈھونڈے بن کہیں
(۳) نظامی کہنہار جس یار ہوئے
سُننہار سن نغز گفتار ہوئے
(۴) نہ باسی دھروں نہ تواسی دھروں
(آج کل کی زبان میں ''باسی تباسی'' کہتے ہیں)۔

جہاں تک موجودہ تحقیقات کی دسترس ہے اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگرچہ دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب نظامی کی مثنوی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس زبان کو مستقل طور پر ادبی صورت میں پیش کرنے کی فضیلت گجرات کو حاصل ہے اور یہ فضیلت اسے صوفیۂ کرام کی بدولت نصیب ہوئی۔

مسلمان سلاطین میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور ۶۹۶ھ میں گجرات پر تسلّط کرلیا۔ اس وقت سے اس علاقے کے صوبے دار دلّی کی سلطنت کی طرف سے مقرر ہوکر آتے رہے۔ صوبے دار کے ساتھ لاؤلشکر، مختلف پیشہ ور، شاگرد پیشہ، ملازمین، مصاحبین وغیرہ کی ایک کثیر جماعت ہوتی تھی اور ان کے لواحقین اور اہل وعیال بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ دوسرے ساز وسامان کے ساتھ دلّی کی زبان بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ گویا دلّی کا اثر اس علاقے پر امیر خسروؒ کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔

تیمور کے حملے کے بعد جب دلّی کی حکومت میں ضُعف پیدا ہوا اور صوبے دار ظفر خان نے مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے ۸۰۶ھ میں گجرات کی خود مختار حکومت قائم کر لی تو شمالی ہند سے شرفا کی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے گجرات آ گئی۔ ان میں کچھ ایسے بزرگ بھی تھے جو علومِ ظاہر و باطن کے عالم اور صاحبِ عرفان تھے؛ چنانچہ شیخ احمد کھٹو (م ۸۴۹ھ) اور حضرت قطبِ عالم [بن مخدوم جہانیاںؒ بخاری] (۷۹۰-۸۵۰ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اقوال مقالہ نگار اپنی تالیف اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیۂ کرام کا کام میں نقل کر چکا ہے۔ اس زبان میں ان حضرات کی کوئی مستقل تصنیف و تالیف نہیں، لیکن ان کے مریدوں میں بعض ایسے بزرگ ہیں جن کی مستقل تصانیف اس زبان میں پائی جاتی ہیں۔

ان میں ایک قاضی محمود دریائی ہیں، جن کا شمار گجرات کے اولیاء اللہ میں ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔ زبان ہندی نُما ہے، مقامی رنگ صاف ظاہر ہے، گجراتی، فارسی اور عربی لفظ بھی کہیں کہیں استعمال کیے ہیں، کلام کا طرز بھی ہندی ہے۔ چونکہ سماع کا خاص ذوق تھا اس لیے ہر نظم کی ابتدا میں اس کے راگ یا راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ ان کا مشرب عشق و محبت ہے اور سارا کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ ان کا کلام (زبان کی اجنبیت کی وجہ سے) مشکل ہے، آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ نمونے کے طور پر چار شعر لکھے جاتے ہیں، اس سے ان کی زبان اور طرزِ کلام کا اندازہ ہوگا:-

نینوں کاجل، مکھ تنبولا، ناک موتی، گل ہار
سیس نماؤں نیہ اپاؤں اپے پیر کروں جو ہار

(یعنی آنکھوں میں کاجل، منہ میں پان، ناک میں موتی، گلے میں ہار۔ اس سج دھج سے میں سر کو جھکاؤں، محبت کروں اور پیر کو آداب کروں)

کوئی مایلا مرم نہ بُوجھے رے
بات من کی کس نہ سُوجھے رے

(مایلا: اندر کا؛ مرم: بھید)

دکھ جیو کا کس کہوں اللہ
دکھ بھریا سب کوئی رے
نِر دوکھی جگ میں کو نہیں
میں پرتھی پھر پھر جوئی رے

(یعنی اے اللہ! میں اپنے جی کا دُکھ کس سے کہوں؟ سب کوئی دکھ بھرے ہیں۔ میں نے دنیا جہاں میں پھر پھر کے دیکھ لیا۔ کوئی ایسا نہ ملا جو دکھی نہ ہو۔

ایک دوسرے بزرگ شاہ علی جیو کام دھنیؒ ہیں، جن کا مولد و منشا گجرات ہے، گجرات کے کامل درویشوں اور عارفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے پائے کے شاعر ہیں اور ان کا کلام توحید اور وحدت الوجود سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وحدتِ وجود کے مسئلے کو معمولی باتوں اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں، مگر اُن کے بیان اور الفاظ میں پریم کا رس گھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے۔ طرزِ کلام ہندی شعرا کا سا ہے اور عورت کی طرف سے خطاب ہے۔ زبان سادہ ہے، لیکن چونکہ پرانی ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کیے ہیں اس لیے کہیں کہیں سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے:-

(۱) تم ری پیا کو دیکھو جیسا
ہور جیون پر تھو سائیں ایسا
سوے تمھیں ہو ناں وہ ایسا
(۲) اک سمند سات کہاوے
دھونوس بادل مینہ برساوے
وہی سمند ہو بوند کھالے
ندیا نالے ہو کر چالے
(۳) پیو ملا گل لاگ رہی جے
سکھ منہ دکھ کی بات نہ کیجے

ان کے کلام کا مجموعہ جواھر الاسرار کے نام سے موسوم ہے۔ شاہ صاحب کا سنہ وفات ۹۷۳ھ/ ۱۵۶۵ء ہے۔

ایک اَور بزرگ میاں خوب محمد چشتیؒ ہیں۔ یہ بھی احمد آباد (گجرات) کے رہنے والے ہیں۔ ان کا شمار وہاں کے بڑے درویشوں اور اہلِ عرفان میں ہے؛ تصوّف میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے؛ صاحبِ تصانیف اور صاحبِ سخن تھے۔ ان

کی ولادت ۹۴۶ھ/ ۱۵۳۹ء میں اور وفات ۱۰۲۳ھ/ ۱۶۱۴ء میں ہوئی۔ تصوّف میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ سب سے مشہور اور مقبول کتاب خوب ترنگ ہے، جس کا سنہ تصنیف ۹۸۶ھ/ ۱۵۷۸ء ہے۔ یہ خاص تصوّف کی کتاب ہے۔ میاں خوب محمدؒ عالم اور سالک ہیں؛ تصوّف کی اصطلاحات ونکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ اپنی اس کتاب کی شرح انھوں نے امواجِ خوبی کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ خوب ترنگ کے ان کا ایک منظوم رسالہ بھاو بھید صنائع وبدائع پر بھی ہے۔

یہ صوفی شعرا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ہندی میں لکھنے کی معذرت کرتے ہیں اور اپنی زبان کو ''گوجری'' یا ''گجری'' کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دلّی سے جو زبان جنوب کی طرف گئی اس کی دو شاخیں ہوگئیں۔ دکن میں گئی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے دخیل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیت کی وجہ سے گجری، [گوجری] یا گجراتی کہی جانے لگی۔ زبان درحقیقت ایک ہی ہے، بعض مقامی الفاظ اور محاورات کی وجہ سے یہ تفریق ہوگئی۔ آخر میں یہ تفریق مٹ گئی اور دونوں علاقوں کی زبان دکنی ہی کہلائی۔

دکنی زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجاپور تھا، جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیرِسرپرستی اس زبان کو فروغ ہوا۔

اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ امیر الدین عرف میراں جی شمس العشاقؒ ہیں، جو مکّے میں پیدا ہوئے اور بحکم پیر (کمال الدین بیابانیؒ) بھنکار (علاقۂ احمد آباد) میں جا کر مقیم ہوئے۔ وہاں سے کچھ مدّت بعد بعہدِ علی عادل شاہ اوّل (۹۶۵ھ/ ۱۵۵۷ء - ۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء) بیجاپور میں وارد ہوئے۔ نظم ونثر میں ان کے کئی رسالے ہیں، ایک منظوم رسالے کا نام خوش نامہ ہے۔ اس میں وہ تصوّف ومعرفت کی باتیں ایک لڑکی خوش [یا خوشنودی] نامی کی زبانی لڑکیوں کے حالات کی مناسبت سے بیان کرتے ہیں، مثلاً یہ دنیا اس کی سسرال ہے اور عالمِ آخرت اس کا میکا ہے، اس طرح تمام نسوانی لوازمات، مثلاً زیور پہننا، مہندی لگانا اور چرخا کاتنا وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس میں تخمیناً پونے دو سو شعر ہیں۔ ایک دوسری نظم خوش نغز ہے، جس میں خوشی سوال کرتی ہے اور میراں جیؒ جواب دیتے ہیں۔ ایک اَور منظوم رسالہ، جس میں تخمیناً پانچ سو شعر ہیں، تصوّف کے معمولی مسائل پر ہے۔ اس میں وہ ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں۔ میراں جیؒ کا سنہ وفات ۹۷۰ھ کے لگ بھگ ہے۔

میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اور خلیفہ شاہ برہان الدین جانمؒ اپنے وقت کے بڑے عارف اور صوفی نیز بہت خوش گو شاعر تھے۔ یہ علی عادل شاہ اوّل (۹۶۵ - ۹۸۸ھ) اور ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ - ۱۰۳۷ھ) کے عہد کے بزرگ ہیں، کیونکہ ان کے کلام نکتۂ واحد کے ایک ''فرمان'' کا سنہ ۹۶۷ھ اور ایک دوسرے کا ۹۷۷ھ ہے اور ان کی مثنوی ارشاد نامہ کا سنہ تصنیف ۹۹۰ھ ہے۔ مجھے ان کی متعدد نظمیں اور منظوم رسالے ملے ہیں، جن کا ذکر میں نے رسالۂ اردو، ماہ جنوری ۱۹۲۷ء میں کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی نظم (مثنوی) ارشاد نامہ ہے، جس میں تخمیناً اڑھائی ہزار اشعار ہیں۔ ان کی زبان اگرچہ پرانی ہے، لیکن میراں جی شمس العشاقؒ کے مقابلے میں سہل اور سادہ ہے۔ بعض مقامات پر سادگی کے ساتھ کلام میں شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے، مثلاً:

بِن عشق بُدھ کو سوج نہیں
اور بِن بُدھ عشق کو گوج نہیں
جے آپ کو کھوجیں پیو کو پائیں
پیو کو کھوجیں آپ گنوائیں

علاوہ مثنویوں اور دوسری منظومات کے شاہ صاحب نے بہت سے خیال اور دوہے بھی لکھے ہیں، جن کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے اور ہر دوہے کے ساتھ راگ راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ خاندانِ چشتیہ کے بزرگ موسیقی کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ روحانی ذوق پیدا کرنے اور روحانی مدارج طے کرنے میں اسے بہت بڑا مُمِدّ خیال کرتے ہیں۔

ان کی اکثر نظموں کی بحریں ہندی ہیں اور زبان پر بھی ہندی رنگ غالب ہے، البتہ ہندی الفاظ اور اصطلاحات کے ساتھ کہیں کہیں فارسی وعربی الفاظ اور اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں، نیز وہ اپنی نظموں میں ہندو مسلم دونوں روایات و تلمیحات سے کام لیتے ہیں۔ اگر ایک دوہے میں یوسف زلیخا کی تلمیح ہے تو دوسرے میں سری کرشن جی کے قصّے کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ برہان اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں (''یہ سب گجری کیا بیان'')۔

عبدل (عبدالغنی؟) بھی اسی زمانے کا شاعر ہے۔ اس کی تصنیف ابراہیم نامہ ہے، جو اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات میں خود اس کی فرمائش پر لکھا (۱۰۱۲ھ)۔

اسی عہد کا ایک مشہور شاعر حسن شوقی ہے۔ مجھے اس کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں: ایک فتح نامۂ نظام شاہ یا ظفر نامۂ نظام شاہ، جو رزمیہ ہے۔ اس میں ٹالی کوٹ کی مشہور جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ جنگ ۹۷۲ھ/ ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس میں دکن کے فرمانرواؤں، یعنی علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متّحد ہو کر وجیانگر کے راجہ رام راے پر لشکرکشی کی اور اسے شکستِ فاش دی۔ دوسری مثنوی، جس کا نام میزبانی ہے، سلطان محمد عادل شاہ سلطان کی شادی سے متعلّق ہے۔ اس میں شہرگشت اور جشنوں کی دھوم دھام اور میزبانی اور مہمانی کی شان وشوکت کا ذکر ہے۔ ان مثنویوں کی زبان قدیم دکنی اردو ہے، مگر نسبتۃً سہل ہے؛ بیان میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ شوقی کی غزلیں بھی مجھے ملی ہیں۔ ان میں بعض مسلسل اور مرصّع ہیں، اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو ولی اور اس کے بعد کے اساتذہ کی غزلوں کے مقابلے میں کسی طرح کم تر نہیں۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں قدیم دکنی اردو کا خاصا رواج ہو گیا تھا اور یہ سرکاری دفاتر میں بھی پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ خود بھی شاعر اور موسیقی کا

دلدادہ تھا؛ اسی بنا پر اس نے ''جگت گرو'' کا لقب پایا۔ اس کی مشہور کتاب نورس فنِ موسیقی پر ہے، جس پر ظہوری نے دیباچہ لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی زبان ہندی ہے، کہیں کہیں کوئی دکنی لفظ آ جاتا ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ (۱۰۳۷-۱۰۶۷ھ) تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں بھی اردو کا رواج برابر بڑھتا رہا۔ اس عہد کے تین شاعر قابلِ ذکر ہیں: ایک مقیمی (مرزا مقیم خان) مصنّف چندر بدن مہیار (۱۰۵۰ھ)؛ دوسرا ملک خوشنود مصنّف جنت سنگھار (قصۂ بہرام)، ترجمۂ ھشت بہشت امیر خسرو، سنہ تصنیف ۱۰۵۵ھ؛ تیسرا رستمی (کمال خان)، جو بہت پُرگو شاعر تھا۔ اس کی تصنیف خاور نامہ ایک ضخیم رزمیہ مثنوی ہے، جو چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ فارسی خاور نامہ کا ترجمہ ہے اور اس میں حضرت علیؓ اور ان کے رفقا کی لڑائیوں کی فرضی داستان ہے؛ سنہ تصنیف ۱۰۵۹ھ ہے۔

محمد عادل شاہ کے جانشین علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷-۱۰۸۳ھ) کے عہد میں دکنی اُردو کو خوب فروغ ہوا۔ اس بادشاہ نے اردو کی طرف خاص توجہ کی۔ وہ خود بھی بہت اچھا شاعر تھا اور شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔ اس کا کلیات موجود ہے، جس میں اس کا کلام اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ہے۔

اس عہد کا سب سے بڑا شاعر نصرتی ہے، جو علی عادل شاہ کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ وہ رزم و بزم دنوں میں یدِطولیٰ رکھتا ہے۔ اس سے تین مثنویاں یادگار ہیں: (۱) گلشنِ عشق، جو نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے (۱۰۶۷ھ) اور منوہر اور مدمالتی کے عشق کی داستان ہے؛ (۲) علی نامہ، جس میں علی عادل شاہ کی ان جنگی مہمات کا بیان ہے جو اسے مغلوں اور مرہٹوں کے خلاف لڑنا پڑیں۔ یہ بڑے پائے کی مثنوی ہے۔ اس میں شاعر نے تاریخی واقعات کی تفصیل، مناظرِ قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صنّاعی سے کھینچا ہے۔ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی (سنہ تصنیف ۱۰۷۲ھ)؛ (۳) تاریخ اسکندری، جس میں علی عادل شاہ کے جانشین اور عادل شاہی سلطنت کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳-۱۰۹۷ھ) کی اس لڑائی کا بیان ہے جو اسے شیواجی بھونسلہ سے لڑنا پڑی۔ یہ ۱۰۸۶ھ کی تصنیف ہے۔ نصرتی کے قصائد بھی بہت پُرشکوہ ہیں اور زورِ بیان، علوِ مضامین اور شوکتِ لفظی میں بے مثل ہیں۔

شاہ امین الدین اعلیٰؒ نے اپنے والد حضرت برہان الدین جانمؒ اور اپنے دادا میراں جی شمس العشاقؒ کی پیروی میں متعدد نظم و نثر کے رسالے تصوّف کے مسائل پر لکھے۔ ان کی زبان نسبتاً آسان ہے۔

اس عہد کا ایک بڑا شاعر سیّد میراں ہاشمی گزرا ہے، جو مادرزاد اندھا تھا۔ اس کی مثنوی یوسف زلیخا بہت مشہور ہے۔ اس نے غزلیں بھی لکھی ہیں، جن میں ریختی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرزِ کلام کا لکھنے والا یہ پہلا شخص ہے۔

دکنی اردو کا تیسرا مرکز گولکنڈہ یعنی قطب شاہیوں کا دارالحکومت تھا۔ قطب شاہی بادشاہ علم و ہنر کے بہت قدردان تھے؛ بالخصوص اس خاندان کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی (۹۸۸ھ/ ۱۵۸۰ء-۱۰۲۰ھ/ ۱۶۱۱ء) کے عہد میں ملک نے خوش حالی میں اچھی ترقی کی اور علم و فن اور شعر و شاعری کا خاصا چرچا رہا۔ بادشاہ خود بڑا شاعر تھا۔ اس کا کلیات بہت ضخیم ہے۔ وہ بہت پُرگو اور قادرالکلام شاعر ہے۔ غزل کے علاوہ اس نے قصیدے، مثنویاں، مرثیے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ متعدّد قصیدے اور مثنویاں مظاہرِ قدرت، تہواروں، رسم و رواج، موسموں، میووں اور اپنے باغوں اور محلوں وغیرہ پر لکھی ہیں۔ محمد قلی کا کلام بہت قدیم ہے، لیکن اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو اس کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو بعد کے نامور شعرا میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا مستند کلیات (مرتبۂ ۱۰۲۵ھ) بالکل جدید طرز پر مرتّب ہوا ہے؛ اردو کے علاوہ فارسی کلام بھی ہے؛ اکثر غزلوں میں ہندی اسلوبِ بیان پایا جاتا ہے۔

اس کا بھتیجا اور جانشین محمد قطب شاہ (۱۰۲۰-۱۰۳۵ھ) بھی، جس نے سلطان محمد قلی کا کلیات مرتّب کیا ہے، شاعر تھا اور ظلُّ اللہ تخلص کرتا تھا۔ محمد قطب شاہ کا فرزند اور جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا۔ اس کا دیوان بھی موجود ہے۔

قطب شاہی عہد کے تین شاعر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: (۱) وجہی، مصنّف قطب مشتری (۱۰۱۸ھ)۔ یہ نظم دکنی اور ادب کی ابتدائی مثنویوں میں بڑی پائے کی ہے۔ یہ در پردہ محمد قلی قطب شاہ کی داستانِ عشق ہے؛ انجمنِ ترقی اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری تصنیف سب رس ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا؛ (۲) غوّاصی، جس کی دو مثنویاں سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۰۳۵ھ) اور طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) بہت مشہور ہیں۔ سیف الملوک و بدیع الجمال اسی نام کے فارسی قصّے کا اور طوطی نامہ ضیاء الدین بخشی کے طوطی نامہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ غوّاصی کا دیوان بھی موجود ہے۔ وہ بہت خوش گو شاعر ہے۔ اس کی غزلوں کی زبان صاف اور فصیح ہے۔ اس کے قصیدوں میں بھی شوکت پائی جاتی ہے؛ (۳) ابن نشاطی، مصنّف پھول بن۔ یہ ایک فارسی قصّے بساتین کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس نے صنائع بدائع سے خوب کام لیا ہے اور ساری مثنوی مرصّع ہے لیکن سادگی اور روانی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال پر اس کے حصّے بخرے ہو گئے اور پانچ نئی خودمختار سلطنتیں قائم ہو گئیں، یعنی قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، برید شاہی۔ ان سب حکومتوں نے قومی زبان اردو (دکنی) کی سرپرستی کی۔ نظام شاہی حکومت کا بانی ملک احمد بحری الملقّب بہ نظام الملک (۸۹۵-۹۱۴ھ) ہے۔ اس کے زمانے کے ایک شاعر کا پتا لگا ہے، جس کا تخلّص اشرف ہے۔ اس کی مثنوی نوسرہار شہدائے کربلا کے بیان میں ہے۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف، جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے، ۹۰۹ھ ہے:

بازان جو تھی تاریخ سال
بعد از نبی ہجرت حال
نو سو ہوئے اگلے نو
یہ دکھ لکھیا اشرف تو

اگرچہ یہ مثنوی دکنی اردو کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے اور بہت قدیم ہے لیکن اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور دوسری دکنی کتابوں کی طرح، جو بعد کی اور بہت بعد کی ہیں، مشکل اور سخت نہیں ہے۔ اس میں ٹھیٹ دکنی الفاظ اور ہندی سنسکرت کے مشکل الفاظ نہیں ہیں.

بریدشاہی حکومت کا بانی قاسم برید تھا۔ اس نے اپنا دارالحکومت بیدر قرار دیا، جو بہمنی سلطنت کا بھی دارالخلافہ تھا۔ اس کے فرزند امیر برید کے عہد میں ایک شاعر شہاب الدین قریشی گزرا ہے۔ اس کی کتاب بھوگ بل، جو کوک شاستر کا ترجمہ ہے، امیر برید کے نام معنون ہے:

اہے شہر بیدر سچا تخت گاہ
کہ بیٹھا امیر شاہ سا بادشاہ

کتاب کے آخر میں سنہ تصنیف (۱۰۲۳ھ) بھی بیان کر دیا ہے:

ہزار اور تیویس تھے سال جب
کیا میں مرتّب سو خوش حال سب

گجرات و دکن میں اردو کی ترویج و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد تک پہنچتا ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ بتدریج ہندی کے غریب، ناملائم اور نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے اور عربی فارسی الفاظ بڑھتے گئے، حتّٰی کہ ولی دکنی (گجراتی) کے کلام میں ہندی فارسی الفاظ کا مناسب توازن نظر آتا ہے۔ یہ ہونا لازم تھا، کیونکہ اردو شاعری کی تمام اصناف فارسی کی مرہونِ منّت ہیں اور ان کے ادا کرنے میں بھی فارسی کی تقلید کی گئی ہے، اسی لیے اب تک اردو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چھایا رہا۔ عہدِ عالمگیر کے آخر زمانے میں اردو ادب کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ولی دکنی کا انتقال شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے ایک سال بعد ۱۱۱۹ھ میں ہوا۔ اس سے چند سال پہلے (۱۱۱۲ھ میں) وہ دلّی آیا تو اہلِ ذوق اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوے اور وہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ وہاں کے موزوں طبع حضرات نے اسی طرز میں غزل گوئی شروع کر دی۔ اس سے قبل شمالی ہند میں کوئی غزل گو شاعر نہیں پایا جاتا۔ ولی کو بھی دلّی کی زبان سے فیض پہنچا، ولی غزل کا شاعر ہے۔ قدما کی زبان میں جو کرختگی اور ناہمواری تھی وہ ولی کی زبان میں نہیں۔ اس کی زبان میں لوچ اور لطافت اور بیان میں لذّت اور روانی پائی جاتی ہے۔ تصوّف کے لگاؤ نے اس کے کلام میں دردمندی پیدا کر دی ہے۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا موزوں تناسب قائم رکھا ہے۔ اگر وہ بہت بلند پروازی نہیں کرتا تو پستی کی طرف بھی نہیں جاتا.

دکن میں ولی کے ہم عصر اَور بھی کئی شاعر تھے۔ ان میں صرف چند قابلِ ذکر ہیں: (۱) امین گجراتی، مصنّفِ یوسف زلیخا (۱۱۰۹ھ)؛ (۲) قاضی محمود بحری، جن کی مثنوی من لگن دکن میں بہت مقبول ہوئی اور بارہا طبع ہوئی۔ ان کا کلیات بھی ہے، جس میں غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی بنگاب ہے۔ بحری نے شراب کے بجاے لفظ بنگ استعمال کیا ہے۔ ان کا کلام بڑے پائے کا ہے؛ (۳) وجیہ الدّین وجدی، جن کی مثنوی پنچھی باچا (۱۱۳۱ھ)، ترجمۂ منطق الطیر، بہت مشہور ہے.

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز محمد شاہ بادشاہ (۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۹ء - ۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ء) کے وقت سے ہوتا ہے۔ ولی کا دیوان دلّی میں پہنچا تو غزل گوئی کا چرچا شروع ہو گیا تھا۔ شاہ مبارک آبرو (م ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰ء)، شاہ حاتم (۱۱۱۱ھ/ ۱۶۹۹ء - ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۱ء)، شرف الدین مضمون (م ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء)، سیّد محمد شاکر ناجی، وغیرہ نے اسی رنگ میں غزل گوئی کا آغاز کیا.

اس عہد میں خواجہ میر درد (۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۱ء - ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۴ء) اپنے کلام اور بزرگی کی وجہ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا کلام اپنی خصوصیت کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ فارسی اور ہندی کے اثر سے تصوّف اردو شاعری میں پہنچ گیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں صوفیانہ شاعری کا حق خواجہ صاحب ہی نے ادا کیا ہے۔ ان کا تصوّف عطّار و سنائی سے ملتا ہے نہ کہ حافظ و خیام سے۔ ان کا طرزِ بیان پاک، صاف، رواں اور پختہ ہے اور تاثیر سے خالی نہیں۔ ان کا شمار اپنے وقت کے اولیا اور عارفوں میں تھا۔ ان کے کلام میں بھی عرفان و معرفت کی نمایاں جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ بڑے خوددار اور اعلیٰ سیرت کے بزرگ تھے۔ جب دلّی پر پے بہ پے آفات نازل ہوئیں اور شعر و سخن کا کوئی سرپرست نہ رہا تو شعراے عظام دلّی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوے، مگر خواجہ صاحب کے پاے استقامت میں لغزش نہ آئی.

لیکن اردو کے کمال کا زمانہ میر تقی میر (۱۱۲۵ھ/ ۱۷۲۲ء [؟ ۱۷۱۳ء] - ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء) کا زمانہ ہے۔ میر کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے والد ایک گوشہ نشین، متوکّل درویش تھے۔ ان کی نوعمری کا بڑا حصّہ شب و روز درویشوں کی صحبت میں گزرا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں وہ یتیم ہو گئے اور تلاشِ معاش میں دلّی سے آگرے آئے۔ اس وقت مغلوں کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا۔ نادرشاہ کی یورش کے بعد احمد شاہ درّانی کے حملوں اور مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گری نے مغل سلطنت کی رہی سہی وقعت خاک میں ملا دی تھی۔ ان تمام واقعات کا اثر میر کے دل پر بہت گہرا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حُزن و یاس، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ ہے اور جذبات کے اظہار میں خلوص پایا جاتا ہے۔ زبان میں خاص گھلاوٹ، شیرینی، سادگی اور موسیقیت ہے۔ یہ خوبیاں یک جا کسی اَور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر اس میں ان کی ہمسری کا دعوٰی نہیں کر سکتا۔ تمام باکمال شعرا نے انھیں استادِ غزل مانا ہے۔ ان کی

بعض مثنویاں بھی بڑے پائے کی ہیں۔ وہ بہت بلند سیرت کے شخص تھے۔ خودداری اور بے نیازی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور اسی وضع سے ساری عمر نباہ دی۔ جب شاہ عالم کے زمانے میں شعر وسخن کی پہلی سی قدر اور سرپرستی نہ رہی تو دلّی کی ساری رونق لکھنؤ آ گئی۔ میر صاحب بھی نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے آئے۔

ان کے ہم عصر سودا (۱۱۲۵ھ/ ۱۷۲۲ء [؟ ۱۷۱۳ء] - ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء) کو وہ مرتبہ حاصل نہیں۔ ان کے دیوان میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ مصاحب اور درباری تھے، اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھتے تھے، اکثر اوقات خواہ مخواہ جھگڑے مول لیتے تھے اور لمبی لمبی ہجویں کہتے تھے؛ لیکن باوجود اس کیچڑ کے جو انھوں نے اچھالی ہے وہ بہت قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا شمار اردو کے اوّل درجے کے باکمال اساتذہ میں ہے۔ اردو زبان میں ان کے قصائد اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں شکوہ، بیان میں قدرت اور وسعتِ نظر پائی جاتی ہے۔ وہ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔

میر حسن (م ۱۲۰۱ھ/ ۱۷۸۶ء) اپنے زمانے کے رسوم وعادات کے مصوّر ہیں۔ وہ ہر چیز کو صحیح طور سے اور اصلی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ وہ حقیقت نگار ہیں۔ ان کی مشہور مثنوی سحر البیان میں قدرتی مناظر اور انسانی جذبات دونوں کا بیان موجود ہے؛ نیز حسنِ بیان اور لطفِ زبان بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ اردو زبان میں یہ مثنوی بہت مقبول ہوئی اور اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس نظم کا قصّہ قدیم طرز کا ہے۔

مصحفی (م ۱۲۴۱ھ/ ۱۸۲۵ء) بہت پُرگو، مشّاق اور پختہ شاعر تھے؛ فنِ شعر کے نکات پر گہری نظر تھی۔ ان کا کلام آٹھ جلدوں میں ہے۔ سودا کے انداز میں قصیدے بھی بہت لکھے۔ زبان میں صفائی اور روانی ہے اور ہر قسم کے مضمون ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے استاد ہونے میں کچھ شُبہہ نہیں۔

اب رنگین (م [۱۲۵۰ھ/] ۱۸۳۴ء) وانشا (م ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) کا دَور آتا ہے۔ یہ بھی سودا، میر اور حسن کی طرح لکھنؤ آ گئے تھے۔ لکھنؤ اس زمانے میں عشرت پسندی، تکلّفات اور نمود ونمائش کا مرکز تھا۔ یہ رنگ وہاں کے تمدّن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں نظر آتا تھا۔ سادگی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی تھی۔ اسی رنگ میں شاعری بھی رنگ گئی۔ رنگین ریختی کا موجد ہے، یعنی وہ اس طرز کا بانی ہے جس میں سارا کلام عورتوں ہی کی زبان میں اور عورتوں ہی کے متعلّق ہوتا ہے۔ وہ جامِ ہندی کا مے نوش ہے، مگر اس کا معیار ادنیٰ ہے۔ اس کی شاعری تمام تر شہواتِ نفسانی سے پُر ہے۔ انشا شہواتِ نفسانی کا دلدادہ نہیں، مگر بڑا زندہ دل، خوش طبع اور ظریف ہے؛ خوب ہنستا اور ہنساتا ہے۔ انشا اردو ادب میں ایک شان دار کھنڈر کی مانند ہے۔ وہ سچا شاعر تھا جو زمانۂ زوال میں پیدا ہوا، جب کہ عزّتِ نفس اور خودداری کی جگہ غلامی نے لے لی تھی۔ انشا زندگی کو کھیل سمجھتا ہے۔ اس کی نظم کا رنگ بہت شوخ ہے اور جذبات جھوٹے ہیں۔ وہ فنِ شعر کا استاد ہے۔ اس میں بلا کی جدّت اور طبّاعی ہے۔ اگرچہ اس کے تکلّفات اور تصنّعات سے اردو ادب کو ایک طرح سے نقصان پہنچا مگر پھر بھی اس نے بیان میں شگفتگی، تازگی اور وُسعت پیدا کی ہے۔ اس کا اثر خیر وشر دونوں جانب ہے۔ وہ اس بَرِّعظیم کی متعدّد زبانیں جانتا تھا۔ اردو زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس پر اس کا کلام اور بالخصوص اس کی کتاب دریاے لطافت شاہد ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک اہلِ زبان نے اردو صرف ونحو اور لسانیات پر لکھی ہے۔ اگر وہ شاہی دربار میں جا کر اپنی ہستی کو نہ کھو دیتا تو سودا کی ٹکّر کا ہوتا اور شاید بعض صورتوں میں اردو کے حق میں بے نظیر کام کر جاتا۔

نظیر (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۰ء)، اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ بہت ناانصافی کی گئی ہے۔ ہمارے شاعروں اور تذکرہ نویسوں نے اسے سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھا۔ اس کی قدر سب سے پہلے اہلِ یورپ نے کی، لیکن انھوں نے اور ان کے مقلّدوں نے اُسے اس قدر بڑھایا جس کا شاید وہ مستحق نہ تھا؛ تاہم اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ اپنی وضع کا ایک ہی شاعر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر ہے۔ اس میں پاک دلی اور معصومیت کے ساتھ انتہا درجے کی رندمشربی بھی پائی جاتی ہے، لیکن یہ بے اعتدالی، جو کہیں کہیں آ جاتی ہے، لُطف سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض اوقات شہوانی خواہشیں اسے گمراہ کر دیتی ہیں، مگر اس کا کمال ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے؛ اس کی شاعری شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کا بہترین کلام وہ ہے جس میں وہ اپنے دیس کا راگ گاتا ہے اور مزے مزے سے ان چیزوں پر نظمیں لکھتا ہے جن کو بوڑھے بچے، امیر غریب، سب پڑھتے اور مزہ لیتے ہیں۔ اپنے وطن کی فطرت کی طرح اس کی طبیعت زرخیز اور مالا مال ہے۔ اس کی اکثر نظمیں پرندوں اور جانوروں کی (مثلاً ہنس بچارا، ریچھ کا بچہ، گلہری کا بچہ) مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ دراصل اپنے زمانے کے معاشرے کے رسوم وعادات پر تنقید ہے۔ اس نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں ہندوستان کے تیوہاروں کا پُرلطف سماں کھینچا ہے۔ اس نے ہندوستان کے موسموں کا حال جس لطف وخوبی سے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدرت کا عاشق ہے۔ اس کا یہ کمال کالی داس سے کم نہیں۔ وہ اپنے اسلوبِ بیان میں بے پروا ہے۔ اس کا کلام عیب سے خالی نہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں لاابالی ہے اور اسے اپنے بیان کی روانی میں کسی چیز کا ہارج ہونا گوارا نہیں۔ اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ عوام کا شاعر ہے۔

ذوق (۱۲۰۴ھ/ ۱۷۸۹ء - ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۴ء) فارسی شعرا کے ایک طویل سلسلے کا مقلّد ہے۔ اس کے قصیدے، جو زیادہ تر آخری مغل بادشاہ کی مدح میں ہیں، اردو زبان میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ غزلوں کی حالت دوسری ہے۔ اس کی طبیعت غزل کے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ فن کے لحاظ سے اس کی غزلیں بے عیب ہیں، مگر ان میں شعریت کم ہے۔ وہ محبت کی گرمی اور جوش سے خالی ہے۔

مومن (۱۲۱۵ھ/ ۱۸۰۰ء - ۱۲۶۸ھ/ ۱۸۵۱ء) ایک عاشق مزاج، لذّت کا دلدادہ، حسن پرست شاعر تھا۔ اگرچہ اس نے قصیدہ، مثنوی وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا اصل کوچہ غزل ہے، جس میں وہ عشقیہ معاملات اور واردات

کو پیش کرتا ہے۔ ان خیالات کے ادا کرنے میں اس نے اکثر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے، لیکن اس کے کلام میں سوز و گداز اور اثر نہیں۔ اس کا عشق صادق نہیں۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ بہت پُر گو شاعر تھے۔ اُن کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں؛ بہت سی اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے، مگر درحقیقت وہ غزل کے شاعر ہیں۔ ابتدا میں شاہ نصیر کے شاگرد رہے۔ ان کے بعد ذوق سے مشورۂ سخن کرنے لگے، جو ان کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ ذوق کی وفات کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے۔ ان کے کلام کا اکثر حصّہ بھرتی کا ہے۔ نئی نئی زمینیں اور نئے نئے قافیے اور ردیفیں نکالنے کا بہت شوق تھا، لیکن اکثر اشعار، جن میں وارداتِ قلبی کی کیفیت کا بیان ہے، سوز و گداز اور یاسیت سے پُر ہیں۔ بادشاہ زبان کے بادشاہ ہیں۔ اپنے اشعار میں روزمرّہ اور محاورہ بڑی خوبی سے باندھتے ہیں۔ اس کے لیے ان کا کلام سند ہے۔ بقولِ حالی، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اوّل سے آخر تک یکساں ہے۔ انھیں تصوّف سے بھی بہت لگاؤ ہو گیا تھا؛ چنانچہ ان کے کلام میں صوفیانہ اشعار بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

اس عہد کی شاعری بے مزہ اور تقلیدی تھی، جن میں وہی خیالات، وہی الفاظ، وہی باتیں ہیں، جو بار بار دہرائی جا چکی ہیں۔ شمعِ نظم بجھنے کو تھی کہ غالب ایک شعلۂ طُور کی طرح نمودار ہوا۔

غالب سپاہی خاندان کا تھا۔ اس کی رگوں میں تُرک کا خون تھا، جس نے اس کی شاعری میں گرمی پیدا کر دی۔ ابھی وہ مکتب ہی میں تھا کہ اس نے شاعری شروع کر دی، لیکن اس کا کمال ۱۸۵۷ء کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا انقلاب اگرچہ ترقی کا انقلاب تھا، مگر غارت گر بھی تھا۔ اس میں بہت سی وہ چیزیں بھی برباد ہو گئیں جو رہنے کے قابل تھیں۔ مغلیہ سلطنت کے جانے سے جو صدمہ غالب کو ہوا اس کا اثر اس کے کلام کے درد و سوز میں پایا جاتا ہے۔

غالب اپنے زمانے سے بہت آگے تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہم عصروں نے اس کی قدر نہ کی۔ غالب کے کلام سے اردو کی جدید شاعری کی داغ بیل پڑی ہے۔ اس میں جدّت و تخیّل کا زور اور ایسی بلند پروازی ہے جو اردو کے کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ غالب کی بدولت اردو شاعری میں فلسفے کا ذوق پیدا ہوا، جس سے وہ اب تک محروم تھی۔ فلسفہ و تصوّف اور سوز و گداز نے مل کر اس کے کلام میں ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے۔

غالب کی طرز مرصّع اور دل نشین ہے۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ اکثر اوقات اس کا اندازِ ادا فارسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ جتا دینا بھی لازم ہے کہ اس کے خیالات کی نزاکت اور جدّت کسی آسان طرز میں ادا نہیں ہو سکتی تھی؛ لیکن جہاں کہیں اس نے صاف شعر کہے ہیں وہ انتہا درجے کے سہل ممتنع ہیں۔ غالب نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی، جس میں آئندہ کی جدید شاعری کا ہیولیٰ موجود تھا۔ وہ بہت زندہ دل، ظریف، خوب صورت اور شان دار شخص تھا؛ دہلی میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مُردوں پر رونا اور آنسو بہانا دنیا کی شاعری کی ایک قدیم طرز ہے، لیکن مسلمانوں کی المیہ شاعری بالخصوص امام حسینؓ کی شہادت سے منسوب ہے۔ ایران میں اس واقعے پر بہت سے مرثیے لکھے گئے ہیں؛ چنانچہ محتشم کاشی کی نظم [ھفت بند] بہت مشہور ہے۔ محتشم ایرانی تھا۔ اس کے اظہارِ غم کا طریقہ عورتوں کا سا ہے۔ اسی کی تقلید ہندوستان کے مرثیہ گو شاعروں نے کی۔ ان میں سے انیس (۱۸۰۲-۱۸۷۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) محتشم کاشی سے سبقت لے گئے ہیں، لیکن ان کے مراثی میں بھی مردانہ پن نہیں ہے؛ [تاہم] حُسنِ بیان و زبان اور مذہب کے جوش نے ان مرثیوں کی قدر و منزلت بہت بڑھا دی ہے اور اس وجہ سے اردو ادب میں مرثیے کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔

میر انیس کے کلام میں واقعاتِ کربلا ایسے فطری احساس سے بیان کیے گئے ہیں اور شہدائے کربلا کی ایسی تصویر کھینچی گئی ہے کہ ان کی شخصیت زندہ نظر آتی ہے۔ ان کے اشعار رواں اور شان دار ہیں اور اکثر اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بات چیت کر رہا ہو؛ لیکن ان پر حُزن و یاس کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ حضرت امامؓ کے عظیم الشّان کارنامۂ شجاعت کو رزمیہ رنگ میں بلند آہنگی سے بیان کرنے کی جگہ اسے مایوسانہ اور زنانہ طرز میں بیان کیا گیا؛ [چنانچہ میر انیس کے مرثیوں کی روشنی میں] آپؓ میں وہ شان نظر نہیں آتی جو صداقت و راستی کے [ایک اتنے عظیم الشّان] شہید میں پائی جانا چاہیے۔ انیس اور دبیر دونوں حضرت حسینؓ کے مصائب و آلام پر عورتوں کی طرح آہ و زاری اور ماتم کرتے ہیں۔ ان تمام نقائص کے باوجود انیس زبان اور فنِ شعر کا باکمال استاد ہے۔

لکھنؤ کے زوال کا زمانہ ردِّ عمل اور رکاؤ کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کے شاعروں کے خیالات میں گہرائی نام کو نہیں؛ کوئی جدید خیال نہیں، کوئی نئی طرز نہیں؛ شاعری انھیں پرانے قالبوں میں ڈھالی جاتی ہے اور تکلّف و تصنّع کی بھرمار ہے۔ آتش اور ناسخ فن کے استاد ہیں، مگر بڑے شعرا میں شمار کیے جانے کے مستحق نہیں۔ ناسخ کے مقلّد اور شاگرد (وزیر، رشک، صبا، بحر، امانت وغیرہ) شاعر نہیں، ضلع جگت باز ہیں۔ ان کی شاعری کا دارو مدار محض الفاظ کے الٹ پھیر، رعایتِ لفظی، روزمرّہ کی پامال تشبیہوں اور استعاروں پر ہے اور ابتذال کی طرف مائل ہے۔

دیا شنکر نسیم کی مثنوی شاعرانہ صنعت کے کمال کا نمونہ ہے، لیکن رعایتِ لفظی کا خبط عیب تک پہنچ گیا ہے۔ شوق کی مثنویاں اس زمانے کے عیّاشانہ معاشرے کا خاکہ ہیں، جس کا اصل منبع واجد علی شاہ کا رنگیلا دربار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مثنویوں کی زبان کی صفائی، بے ساختہ پن اور محاورے اور بول چال کی خوبی قابلِ داد ہے، لیکن شاعر خوش فعلیوں پر جان دیتا ہے اور تلوّن کا شکار ہے۔

داغ اور امیر مینائی کے بعد میر تقی کی قدیم (کلاسیکی) شاعری کی بنیاد ڈھے گئی۔ دونوں کا کلام پستی کی طرف مائل ہے۔ یہ اس مُردہ روایت کے عَلَم بردار ہیں

جس کی ساری کوشش بے اثر چھوٹی چھوٹی خوش نمائیوں میں صرف ہوتی تھی؛ لیکن داغ زبان کا بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی زبان کی سادگی، روانی اور بے ساختہ پن اور اس زبان میں اظہارِ خیال حیرت انگیز ہے۔ اس نے اردو کو روزمرہ، محاورات اور شوخ اسلوبِ بیان سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ بات داغ پر ختم ہے۔ اس کا اثر اس کے ہم عصر شاعروں پر بھی ہوا۔

جب اردو ادب نے محض تمسخُر اور نقّالی کا روپ اختیار کر لیا تو ملک کی دماغی زندگی پر مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہ ہندوستانی طبائع کے لیے خیالات کی نئی دنیا تھی۔ پرانی روایات بدل گئیں۔ [جدید سائنس کی بدولت خیال آرائی کی جگہ حقیقت نگاری نے لے لی]۔ مذاقِ سخن کے اصولوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ مسجّع و مقفّی زبان کے بجائے سادگی اور زنانہ پن کے بجائے مردانہ پن اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔

اس عہد کی ایک ممتاز ہستی محمد حسین آزاد (م ۱۹۱۰ء) ہیں۔ یہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مغرب کی اُبلتی ہوئی شراب سے اپنا جام بھرا۔ وہ زبان کے محقّق اور مسجّع نثر کے استاد تھے، مگر وہ بڑے شاعر نہ تھے۔ وہ صرف مٹی کی مورتیں بنانا جانتے تھے۔ ان کے ہم عصر حالی کی حالت بالکل دوسری تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء- ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء) پانی پت میں پیدا ہوے، جہاں ہندوستان کی تین فیصلہ کن لڑائیاں ہوئیں اور سلطنتوں نے پلٹا کھایا۔ ان کا لڑکپن اور جوانی دلّی میں بسر ہوئی۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس میں سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اقبال کا سورج انھوں نے اپنی آنکھوں ڈوبتا دیکھا تھا۔ ان تمام واقعات کا ان کے قلب پر گہرا اثر ہوا۔ ادبی فیض انھیں شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی سے پہنچا۔

ان کی ابتدائی شاعری عام طرز کی تھی، لیکن جدید اثر نے ان کی شاعری کا رخ فطرت پسندی (نیچرل ازم) اور حقیقت نگاری کی طرف پھیر دیا۔ ان کی قومی اور اخلاقی شاعری علی گڑھ تحریک کا نتیجہ ہے۔ سرسیّد احمد خان کی تحریک سے ملک میں ایک جدید تہذیب کا دور شروع ہوا، جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ حالی نے ان جدید خیالات کا گیت گایا۔ اسلامی حکومتوں کے زوال نے [ان کی شاعری میں] ایک عجیب و غریب درد پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے اس کھوئے ہوے عظمت و جلال کو دلی سوز و گداز اور درد سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مسدّس مدّ و جزرِ اسلام میں تاریخ زمانۂ گزشتہ ہی کو زندہ نہیں کیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرقّع بھی حیرت انگیز صفائی سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کی بنیاد ایک زوال یافتہ قوم کی گہری بے آواز مایوسی پر ہے، جسے پڑھ کر بے اختیار دل بھر آتا ہے، مگر وہ اُسے پھر سے بنانا اور تعمیر کرنا بھی چاہتے ہیں۔

حالی اگرچہ انگریزی زبان کے ادب سے واقف نہ تھے، تاہم وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے باوجود زبان نہ جاننے کے بساط بھر انگریزی خیالات و ادب کی ایک گونہ ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ شاعری حالی کے لیے صداقت کا جذبہ ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات صداقت کی خاطر وہ فن کے حسن سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کے بڑے نقّاد ہیں۔ ان کی زبان پاک، صاف اور پُراثر ہے۔ بول چال کے وہ سادہ، اچھوتے، جان دار الفاظ جن کی اس وقت تک دربار میں رسائی نہیں ہوئی تھی انھوں نے اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کی بے زبان عورتوں کی حمایت بڑی دردمندی سے کی ہے؛ چنانچہ مناجات بیوہ ان کا دوسرا شاہکار ہے، جو انتہائی سادہ اور ایسی زبان میں ہے جو اس موضوع کے لیے خاص طور پر موزوں ہے اور اس قدر پُردرد اور دل گداز ہے کہ اسے پڑھ کر سخت سے سخت دل بھی پسیج جاتا ہے۔ چپ کی داد ان کی ایک دوسری نظم ہے، جس میں اپنے ملک کی عورت کی عصمت، شرافت اور بے بسی کو عجیب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مرثیہ اردو میں شہیدِ کربلا کے لیے مخصوص تھا۔ حالی نے قوم کی بعض برگزیدہ ہستیوں کے ایسے مرثیے لکھے ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں اس سے پہلے نہ تھی۔ غالب کا مرثیہ اردو ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے اور حکیم محمود خان کا مرثیہ گویا دلّی کا مرثیہ ہے۔

مغربی خیالات کے بڑھتے ہوے سیلاب کو دیکھ کر، جو قدیم روایات کو بہائے لیے جا رہا تھا، اکبرالٰہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) نے مشرقی تہذیب و روایات کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور اپنی طنز و تضحیک کے زہریلے تیر یورپ اور اس کی فضولیات کے پرستاروں پر برسانے شروع کیے۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک کو بھی نہیں بخشا۔ علی گڑھ اور سرسیّد احمد خان تو گویا ان کے مزاح و طنز کے خاص ہدف تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یورپ کی مادِیّت کا سیلاب اسلام اور اسلامی ثقافت کو لے ڈوبے۔ ہر نئے خیال اور جدید تحریک کو وہ بدگمانی کی نظر سے دیکھتے اور ان کے ہاتھوں اس کی بُری گت بنتی۔ انھیں خصوصًا ان تنگ نظر ہندیوں سے سخت نفرت تھی جو اندھا دھند اہلِ یورپ کی نقالی کرتے تھے، اگرچہ خود ان کی نظر بھی محدود تھی، نئے خیال سے بدکتے اور مذہب کے نام پر ان کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ ان کا اسلوبِ بیان بہت ستھرا، پُرلطف اور پُرمزاح ہے۔ ان کی طنز بڑی گہری اور کاری ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ بہت مقبول ہوے؛ لیکن یہ مقبولیت اب کم ہوتی جا رہی ہے، کیونکہ ان کے اس قسم کے کلام کا معتدبہ حصّہ وقتی تھا؛ اب اس کا ڈنک نکل گیا ہے۔

شاعری کے اس جدید دور میں تین شخصیتیں دوسروں سے الگ نہایت بلندی پر نظر آتی ہیں۔ غالب، حالی اور اقبال۔ ان تینوں کے کلام نے مُردہ شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ غالب نے اگرچہ کوئی نئی راہ نہیں نکالی، لیکن ان کی جدّتِ فکر، بلندیِ تخیّل اور بیان کی شوخی نے پرانی شاعری میں جان سی ڈال دی۔ باوجود زندہ دلی کے ان کے کلام میں یاسیت جھلکتی ہے۔ اس کے بعد ہی زمانہ بدلتا اور اس

کے ساتھ ہماری شاعری بھی بدل جاتی ہے اور حالی نے تو آ کر ہماری شاعری کا رخ یکسر موڑ دیا۔

اقبال [م ۱۹۳۸ء] میں گو غالب کی سی بلند پروازیِ تخیّل اور حالی کا سا سوز و گداز نہ ہو لیکن ان کے کلام میں جو ولولہ، جوش اور تخلیقی قوّت ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ انھوں نے فرنگی تہذیب، جمہوریت، وطنیت اور مادّیت کے بُت بڑی بے دردی سے توڑے ہیں لیکن ہماری شاعری میں سب سے زیادہ مغربی خیالات سے تمتع انھیں نے حاصل کیا ہے۔ وہ بہت بڑے مفکّر اور عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ انھوں نے ان حکیمانہ افکار کو جو مغرب و مشرق کی حکومتوں کے گہرے مطالعے،، ذاتی غور و فکر اور زندگی کے تجربات سے حاصل ہوے اپنے جذبات و وجدانات میں ڈبو کر شعر کے قالب میں ایسے لطیف، پُر جوش اور انقلاب انگیز پیرائے سے ادا کیے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مُردہ دلوں میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ انھوں نے مسلمانوں کو، جو مغرب سے مرعوب اور برادرانِ وطن سے مجوب، عارضۂ کمتری میں مبتلا، مایوس و دل شکستہ تھے، عزتِ نفس اور خودداری کا پیغام سنایا اور خودی کا جدید تصوّر پیش کر کے ان کی ہمتوں میں بلندی اور عزائم میں استقلال پیدا کیا۔ ابتدا میں انھوں نے مقبولِ عام شاعری کی۔ بعد میں وطنیت کے گیت گائے اور خاکِ وطن کا ہر ذرہ انھیں دیوتا نظر آیا اور وہ ایک نئے شوالے کی بنیاد استوار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ملک کی اجتماعی زندگی اور بنیادی اصولوں پر بھی نظر ڈالی اور بندۂ مزدور کو بیداری کا پیغام دیا۔ آخر میں وطنیت سے نکل کر تعمیرِ ملّت کی طرف مائل ہو گئے اور بنی نوعِ انسان کو اپنا پیغام دیتے ہیں۔ یعنی وہ قوموں کو ایک روحانی رشتے میں منسلک کرنا چاہتے ہیں، جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی پیروی میں ہے۔ ان کے خیال میں اسی میں بنی نوعِ انسان کی مشکلات و مصائب کا حل اور ان کی نجات ہے۔

اقبال نے اپنے کلام سے اردو زبان کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ اس سے پہلے اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اردو کی تنگ دامانی کی شکایت اس شدّت سے باقی نہیں رہ گئی۔ وہ بلاشُبہہ شاعرِ مشرق کے خطاب کے مستحق ہیں۔

اقبال کی شاعری کا اثر بعد کے اردو شاعروں پر بہت کچھ ہوا۔ وہ ان کے خیالات ہی سے متاثر نہیں ہوے بلکہ الفاظ اور تراکیب بھی اسی قسم کی استعمال کرنے لگے۔

غزل اپنی رعنائی، حسنِ بیان، سبک پن، رمزیت اور اشاریت کی وجہ سے ہماری شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ اس کا میدان حسن و عشق ہے۔ اگر کوئی اور بات بھی کہنا ہوتی ہے تو اسی کی بول چال اور اشاروں میں کہنا پڑتی ہے۔ غزل کا قدیم اسلوب داغ پر ختم ہو جاتا ہے۔ حالی کی تنقید نے اسے ایک طرف تو ابتذال و پستی سے بچایا اور دوسری طرف لفظی صنعت گری اور بے جان و بے لطف قافیہ بندی کی مشق سے نجات دلائی۔ حالی کے پیشِ نظر غزل کی اصلاح تھی۔ اس کے سب اتار چڑھاؤ اور محاسن و عیوب ان کی نظر میں تھے۔ ان کی اصلاح [کے خیال] کی محرّک وہ بد ذوقی تھی جس نے غزل کو لفظوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ اس میں خیال کی جدّت تھی نہ تازگی؛ خیال پسِ پُشت جا پڑا تھا۔ حالی کی تنقید نے غزل کو پستی اور لفظی شعبدہ بازی سے نکالا۔ مضامین کے لحاظ سے وسعت کا مشورہ دیا اور اس صنفِ سخن کو زندگی سے قریب تر لانے کی طرف توجہ دلائی۔ [اس کے لیے] صداقت اور خلوص لازم شرط تھی۔ حالی نے خود بھی اس پر عمل کر کے اچھی مثال پیش کی۔ ان کی غزلیں بھی حسن و عشق [کے ذکر] سے خالی نہیں۔ ان میں عشق کے نازک جذبات و احساسات اور انسان کی نفسی کیفیات کو بڑی خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ چونکہ ان کی شاعری کا مقصد قومی اصلاح تھا اس لیے یہ خیالات بھی ان کی غزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس سے بعض اوقات غزل کی وہ شان باقی نہیں رہتی جس سے غزل عبارت ہے، تاہم اس سے وسعت کا رستہ کھل گیا۔ بعد کے شعرا ان کی تنقید اور مثال سے کسی نہ کسی صورت سے ضرور متأثّر ہوتے رہے۔

غزل کی قدیم روایت اس وقت حسرت، اصغر اور فانی کے دم سے قائم تھی۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے حسرت اپنے وقت کے مصحفی ہیں۔ حسرت کی شاعری خالص عشقیہ ہے۔ وہ محبوب کے انداز بیان کرنے میں حقیقت سے ہم کنار معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے عشقیہ واردات کو سچے اور صاف طور سے بیان کیا ہے۔ یہ صوفیہ کا عشق نہیں بلکہ عام انسانوں کا عشق ہے۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں سیاسی رنگ بھی آ گیا ہے، مگر بے اثر ہے۔ غزل میں جدّت کا رنگ بھرنے میں اصغر کا بھی حصّہ ہے۔ ان کا میلان اگرچہ صوفیانہ خیالات کی طرف ہے اور ان کی نظر مسائلِ حیات پر حکیمانہ ہے، لیکن انسانی حُسن کی کیفیات اور اثر کو بھی بڑی خوبی سے اور بعض اوقات کیف آور انداز سے بیان کیا ہے۔ فانی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام پر سراسر حُزن و ملال اور یاسیت چھائی ہوئی ہے، مگر باوجود اس کے وہ حسن و عشق کے اسرار بیان کر جاتے ہیں، جو غزل کے لوازم میں سے ہیں۔ اصغر اور فانی دونوں جذبات کی رَو میں بہ نہیں جاتے اور باوجود وفورِ جذبات کے ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بخلاف ان کے جگر حسن و عشق کے شاعر اور ان کی نفسیات کے ماہر ہیں۔ انھوں نے غزل میں بڑی رنگینی اور سرمستی پیدا کی ہے۔ اس وقت جب کہ نظم کے مقابلے میں غزل کا اقتدار گھٹتا نظر آ رہا تھا جگر نے اس کی پشت پناہی کی اور اپنے والہانہ اور سرور افزا کلام سے تغزّل کا رنگ پھر جما دیا۔

لکھنؤ بھی جدید اثرات سے نہ بچا۔ وہاں کے شعرا کو اپنی پرانی اور غیر شاعرانہ طرز کو خیر باد کہنا پڑا۔ انھوں نے تصنّع اور لفظی صناعی کو ترک کر کے سادگی اور حقیقت کو پیشِ نظر رکھا۔ چکبست کی غزلیں حسن و عشق کے ذکر سے خالی ہیں۔ وہ وطنیت اور ''ہوم رول'' (Home Rule) کا راگ گاتے ہیں۔ ان کی نظر غزلوں میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف پڑتی ہے، لیکن انھوں نے آدابِ غزل کو ترک نہیں کیا۔ [جدید] شعراے لکھنؤ نے ناسخ کی تقلید چھوڑ کر غالب و میر کی پیروی کی طرف توجّہ کی۔ صفی، عزیز، ثاقب، آرزو اور اثر کا کلام اس

کا شاہد ہے؛ خصوصًا آرزو نے سادہ اردو کو اپنی سریلی بانسری میں ہندی کے سانچے میں خوب ڈھالا ہے اور ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے۔ اثر کی غزل میں سادگی، صفائی، نفاست اور رنگینی پائی جاتی ہے، جس سے ان کی غزل میں تازگی پیدا ہوگئی ہے۔ یگانہ [چنگیزی] میں عاشقانہ رنگ ذرا گہرا ہے۔ وہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہتے۔ ان کی خودداری اور بیباکی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح مسائلِ حیات پر بھی نظر ڈالی ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات کو بھی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ [بحیثیتِ مجموعی] یگانہ نے غزل میں جدّت پیدا کی ہے۔

اقبال کے بعد جس شاعر نے ملک میں عام مقبولیت حاصل کی وہ جوش ہیں، اگرچہ اُن کے کلام میں وہ گہرائی نہیں جو اقبال کے کلام میں ہے۔ وہ اسم با مسمّٰی ہیں۔ شاعرِ شباب بھی ہیں اور شاعرِ انقلاب بھی۔ یہاں رومان اور انقلاب باہم یکجا نظر آتے ہیں۔ وہ بہت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں شان و شکوہ اور ہمہمہ ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بغیر جھجک کے آزادی کے ساتھ کہہ دیتے ہیں۔ انھیں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں کوئی دِقّت پیش نہیں آتی۔ الفاظ ان کے سامنے پرا باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں دریا کی سی روانی ہے۔ بعض اوقات یہ روانی خوفناک طغیانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے؛ خصوصًا جب وہ مظلوموں اور مزدوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر سرمایہ داروں اور حکومتوں پر گرجتے ہیں یا جب وہ فرنگی سیاست کی کارستانیوں اور اپنے قومی معاشرے کی خرابیوں اور بدکاریوں کی قلعی کھولتے ہیں۔ وہ اب غزل سے بیزار ہیں [کیونکہ] غزل میں ان کے خیالات کی گنجائش نہیں۔ حالی اور اقبال نے بھی غزلیں کہی ہیں اور اپنے افکار ان میں ادا کیے ہیں اور اس غرض کے لیے مسلسل غزلوں سے بھی کام لیا ہے، مگر غزل مربوط اور مسلسل خیالات کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے حالی اور اقبال نے دوسری اصنافِ سخن، یعنی مثنوی، قطعہ، مسدّس، ترکیب بند وغیرہ سے کام لیا ہے۔ جوش کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اب وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ان کی بعض خاص نظمیں زندہ رہنے والی ہیں۔ ان کا میلان اشتراکیت کی طرف ہے، مگر عمل کچھ اَور کہتا ہے۔

سیماب بہت پُرگو شاعر ہیں۔ انھوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ فن کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ ان کے کلام میں ایسے جذبات و احساسات نہیں پائے جاتے جو دل پر اثر کریں۔ قریب قریب یہی کیفیت علی اختر کی ہے۔

خالص غزل گویوں کا زمانہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر تک رہا۔ اس کے بعد نئے شاعروں کی آمد ہوئی، جو نظمیں لکھتے ہیں، مگر غزل نے ساتھ نہ چھوڑا بلکہ اس زمانے میں اسے اَور فروغ ہوا اور مشاعروں نے اسے مزید رونق بخشی۔ طرحی مشاعروں کی جگہ غیر طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ مشاعرہ غزل ہی کی طرح بنا تھا اور غزل ہی مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی؛ اب غزل کے ساتھ نظمیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ نئے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعوں سے ان کی سیری نہیں ہوتی۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش اور روش صدیقی کا شمار انھیں شعرا میں ہے۔ انھوں نے مختلف قومی، سماجی اور ملکی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اختر شیرانی اپنے وقت میں رومانیت کے علَم بردار تھے۔ ان کی شاعری میں ترنّم، موسیقیت، شادابی اور شدید عاشقانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ سانیٹ (Sonnet) کو اردو میں شیرانی نے رواج دیا۔

جدید ترین شعرا میں فیض، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور مخدوم محی الدین ترقی پسند ہیں۔ ان کے ہاں رومان و حقیقت یا رومان و سیاست باہم مل جاتے ہیں۔ ن۔م۔راشد، میراجی اور اختر الایمان کے ہاں اشاریت اور ابہام پایا جاتا ہے۔ ان میں جنسی لذت کی طرف میلان بڑھا ہوا ہے، جو بعض اوقات عریانی کی حدود میں بھی جا پہنچتا ہے۔

فراق کی غزل میں بھی نئے دور کا احساس موجود ہے۔ انھوں نے بھی غزل میں وسعت پیدا کی ہے۔ وہ ان کے سماجی، سیاسی اور عمرانی تجربات ہیں جس سے ان کی غزل میں تنوّع پیدا ہو گیا ہے۔ وہ حسن و عشق کی کیفیت کو حقیقی رنگ میں بیان کرتے ہیں اور دیکھ کر ہی نہیں، چھو کر بھی لذّت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مزاج میں رومانیت ہے، جس نے غزل میں خاص شان پیدا کر دی ہے۔ ان کی غزلوں میں فلسفیانہ رجحان بھی ہے، مگر وہ اس دنیا اور مادّی حیات سے آگے نہیں جاتے۔ کچھ شاعر اَور بھی ہیں جن کا کلام منظرِ عام پر آیا ہے، مثلًا قیوم نظر، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیار پوری، مجروح، اختر ہوشیار پوری، عدم، سلام مچھلی شہری، ناصر کاظمی، فضلی، مسعود حسین خان، ابن انشا وغیرہ۔ نئے شاعروں میں دو چار کے سوا ابھی اوروں نے اپنا مقام حاصل نہیں کیا۔ کچھ ابھی سے تھک گئے ہیں اور ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی نئی بات نہیں رہی؛ کچھ ایسے ہیں جن کی شہرت فی الحال ان کی صرف دو چار غزلوں یا نظموں پر ہے اور کچھ ایسے ہیں جنھوں نے ابھی ابھی اس کوچے میں قدم رکھا ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا کہ کون کس رتبے کا ہے۔

اس زمانے میں شعرا نے نئے تجربے بھی کیے ہیں، مثلًا غیر مقفّٰی اور آزاد نظم۔ راشد، میراجی، ڈاکٹر خالد وغیرہ نے کچھ نظمیں اس قسم کی لکھی ہیں۔ اس سے قبل پرانے شاعروں میں مولوی محمد اسمٰعیل، مولانا طباطبائی، مولانا شرر، پنڈت کیفی دہلوی نے بھی [اس میدان میں] طبع آزمائی کی تھی؛ لیکن یہ طرز مقبول نہ ہوئی۔ اس کے لیے بڑی قدرتِ کلام اور ذوقِ سلیم کی ضرورت ہے تاکہ قافیہ و ردیف سے جو ترنّم اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کی کمی کو وہ اپنے اسلوبِ بیان کے حسن اور الفاظ و حروف کی صوت و ترتیب سے پورا کر سکے، لیکن اس طرز سے ہم بے اعتنائی نہیں برت سکتے، کیونکہ جب ہماری زبان میں ڈرامے، رزمیہ نظمیں یا اسی قسم کے موضوعات پر لکھنے کی نوبت آئے گی تو یہ طرز اختیار کرنا پڑے گی۔

ہمارے قدیم شعرا میں محبوب کا تصوّر خیالی تھا۔ نئے شاعروں میں یہ تصوّر زیادہ تر حقیقی اور مادّی ہے۔ ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بہت سے ایسے ہیں جن پر فرائڈ (Freud) اور مارکس (Marx) کے نظریوں کا اثر ہے۔

ان میں سے ایک کا تعلق نفسیات سے ہے اور دوسرے کا سیاسیات سے۔ ان نظریوں سے بلاشُبہہ ہمارے ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ نفسیات نے اندرونی کیفیات کے تجزیے میں مدد دی اور اشتراکیت نے فرد اور معاشرے کے امتیاز اور ان کے حقوق اور ذمے داریوں کو سمجھایا، لیکن جن ادیبوں نے ان نظریوں کو تنقیدی نظر سے نہیں پرکھا وہ غلط رستے پر جا پڑے؛ کچھ تو تحتِ شعور کے فلسفے میں گم ہو کر لذّت پرستی کے عارضے میں مبتلا ہو گئے اور کچھ بغیر یہ سمجھے کہ وہ کس ماحول اور کس معاشرے میں ہیں بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

ہر زبان کے ادب میں اوّل قدم گیت، نظم یا شعر کا آیا۔ نثر بہت بعد کی چیز ہے۔ اردو ادب کا آغاز بھی اِسی نہج سے ہوا۔ نظم کی طرح نثر کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب معراج العاشقین سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت مَیں گزشتہ اوراق میں لکھ چکا ہوں۔ اس سے قطع نظر کی جائے تو سب سے قدیم نثر ہمیں میران جی شمس العشّاق ؒ کی ملتی ہے۔ اُن کا ایک مختصر رسالہ ہے، جس کا نام شرح مرغوب المطلوب ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے دس باب ہیں، جن میں شریعت اور طریقت کی باتیں بیان کی ہیں؛ نمونہ اس نثر کا یہ ہے: ''خدا کہیا تحقیق مال اور پینگڑے (=اولاد) تمھارے دشمن ہیں۔ چھوڑیو دشمنان کوں۔ اے کیسا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (=اندھا) کیا موت کی یاد تھی (=سے) تجھے بسرا[کر]''۔

دکنی نثر کی دوسری کتاب شرحِ تمہید ہمدانی یا شرحِ شرح تمہید ہے۔ یہ تمہیدات عین القضاۃ کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاہ میران (شاہ میران حسینی یا میران جی خدانما ؒ)، امین الدین اعلیٰ ؒ کے مرید اور ساکن بلدۂ حیدرآباد دکن ہیں۔ ان کا سنہ وفات ۱۰۷۴ھ ہے۔ کتاب کی زبان ٹھیٹ دکنی اردو ہے، لیکن صاف ہے، مغلق نہیں۔ کتاب میں تصوّف کے مسائل، مسائلِ شرعیہ، عقائد اور قرآن کی بعض آیات کے باطنی معانی بیان کیے گئے ہیں۔ میرے کتب خانے میں اس کے تین نسخے ہیں؛ سب سے قدیم نسخے میں سنہ کتاب ۱۰۱۲ھ لکھا ہے۔ اس حساب سے یہ دکنی اردو کی بہت قدیم کتاب ہے۔

میراں جی شمس العشاق ؒ کے فرزند و خلیفہ برہان الدین جانم ؒ (م ۹۹۰ھ) کا ایک خاصا بڑا رسالہ کلمۃ الحقائق دکنی اردو میں ہے۔ اس میں تصوّف کے مسائل بطرزِ سوال و جواب بیان کیے گئے ہیں۔

مذکورۂ بالا کتابیں اگرچہ اردو نثر کی قدیم ترین کتابیں ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ادبی نظر سے ان کا درجہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ ملا وجہی کی سب رس پہلی کتاب ہے جو اس بلند مرتبے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یہ ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں حسن و عشق کی عالم گیر حقیقت کو مجاز کی صورت دے کر قصّے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور دونوں کو میدانِ کارزار میں لا کر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر دیا ہے۔ پوری کتاب مقفّٰی عبارت میں ہے۔ باوجود قافیے کی پابندی کے اسلوبِ بیان صاف، شگفتہ اور رواں ہے۔ زبان چونکہ پرانی ہے، بعض الفاظ اور محاوروں کے سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ اردو ادب میں یہ کتاب خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وجہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی زبان کو ''زبانِ ہندوستان'' لکھا ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ نے، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، نثر میں بھی بعض رسالے لکھے ہیں۔ ان میں ایک گفتارِ شاہ امین ہے، جس میں تصوّف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ دوسرا مختصر رسالہ گنج مخفی ہے۔ اس میں شاہد و شُہُود کی بحث ہے۔

اسی عہد کی ایک کتاب شمائل الاتقیاء ہے، جو ترجمہ ہے اسی نام کی ایک کتاب کا، جس کے مصنّف رکن عماد الدین دبیرِ معنوی و مریدِ برہان الدین غریب ہیں۔ مترجم کا نام میراں یعقوب ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے ۱۰۷۸ھ میں شروع کیا اور کئی سال میں ختم ہوا۔ کتاب کا موضوع تصوّف و طریقت کے مسائل ہیں۔ خاصی ضخیم کتاب ہے۔ عبارت سادہ ہے۔ میرے نسخے میں سنہ کتابت ۱۱۰۵ھ ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں لکھا ہے کہ میر محمد حسین المتخلّص بہ کلیم جوان محمد شاہی نے [ابن العربی کی] فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اور ایک کتاب نثر ہندی میں بھی لکھی تھی، جس کے دو ایک جملے بطورِ نمونہ تذکرے میں نقل کیے ہیں۔ یہ جملے بہت اچھی صاف اردو میں ہیں۔ تذکرہ ۱۱۸۸ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان کسی سنہ میں لکھا گیا ہے۔ اس وقت کلیم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شمالی ہند میں یہ دو کتابیں اردو نثر کی پہلی کتابیں ہیں، مگر نایاب ہیں؛ اب تک ان کا کہیں پتا نہیں لگا۔

دوسری کتاب نوطرزِ مرصّع ہے، جس کے مصنّف میر محمد حسین عطا خان متخلّص بہ تحسین ہیں۔ یہ بہت اچھے خوش نویس تھے اور اس بنا پر ان کا خطاب مرصّع رقم تھا۔ اس کتاب کی تکمیل مصنّف نے وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ (نواب اودھ) کے سایۂ عاطفت میں کی اور ان کے حضور میں پیش کرنا چاہتے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی گئی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ یہ وہی قصّہ ہے جسے میر امّن نے باغ و بہار یا قصۂ چار درویش کے نام سے لکھا ہے [اور جو فارسی کتاب باغ و بہار کا ترجمہ ہے]۔ نوطرزِ مرصّع کی عبارت رنگین اور تشبیہات و استعارات سے مملو ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام قصّہ گویوں کا طرز اختیار کیا ہے۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۱۶۳-۱۲۳۳ھ/ ۱۷۵۰-۱۸۱۸ء [؟۱۸۰۸ء]) اور ان کے بھائی شاہ عبد القادر (۱۱۶۷-۱۲۳۰ھ/ ۱۷۵۳-۱۸۱۵ء) نے قرآن مجید کے ترجمے اردو میں کیے؛ لیکن یہ ترجمے بالکل لفظی ہیں؛ عبارت کا تسلسل اردو بول چال کے مطابق نہیں۔ شاہ عبد القادر ؒ کو اس ترجمے میں اٹھارہ سال لگے اور وہ ۱۲۰۵ھ/ ۱۷۹۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ اسی زمانے میں حکیم شریف

خان دہلوی نے شاہ عالم بادشاہ کی فرمائش پر قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے خاندان میں حکیم محمد احمد مرحوم کے قبضے میں تھا۔ ترجمے کے آخر میں کاتب نے روز جمعہ ۹ ذیقعدہ لکھا ہے۔ حساب کرنے سے اس کا سنہ ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء برآمد ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے ترجمے کی زبان زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں سختی نہیں برتی گئی، اگرچہ شاہ صاحب کے ترجمے کی سی ادبی خوبیاں کسی دوسرے ترجمے میں نہیں۔ حکیم شریف خان کا انتقال ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں ہوا۔

جدید اردو نثر کی بنیاد دراصل فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں پڑی۔ یہ کالج لارڈ ولزلی نے ۴ مئی ۱۸۰۰ء میں قائم کیا۔ اس کا مقصد ان نوعمر انگریزوں کو تعلیم دینا تھا جو انگلستان سے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ چونکہ آگے چل کر ان کا تقرّر ذمے دار عہدوں پر ہوتا تھا اس لیے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا کہ وہ اہلِ ملک کی زبان اور اہلِ ملک کے خیالات اور رسم و رواج اور آئین و قوانین سے واقف ہو جائیں۔ اس ضمن میں کالج نے ہندوستانی زبان یعنی اردو کی بڑی خدمت کی۔ اردو میں سادہ اور روزمرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا اور مقفّٰی اور مسجّع عبارت ترک کر دی گئی۔ پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں، جن میں کچھ ترجمے تھے، کچھ تالیفات اور کچھ انتخابات، جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات، صرف و نحو اور مذہب پر مشتمل تھے۔ کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کیے۔ ایک تو روزمرہ کی زبان کو سلاست اور صفائی کے ساتھ لکھنا سکھایا، دوسرے اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز کی کتابیں لکھنے کی کوشش کی۔ اس میں کالج کے ڈائرکٹر جان گلکرائسٹ (John Gilchrist) کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک اَور اچھا کام کالج نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اس میں چھپنے لگیں۔

کالج کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں، خصوصًا میر امّن کی باغ و بہار زبان کی فصاحت و سلاست اور بے تکلّف طرزِ بیان کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میر امّن کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور ہر موقع پر اس کی مناسبت سے صحیح اور ٹھیٹ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اور ہر کیفیت اور واقعے کا نقشہ اس خوبی سے کھینچتے ہیں کہ ان کے کمال انشا پردازی کی داد دینا پڑتی ہے۔ میر امّن کے علاوہ میر شیر علی افسوس بھی کالج میں ملازم تھے۔ ان کی کتاب آرایش محفل، جو سبحان رائے کی خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہے، بہت مشہور ہے۔ انھوں نے گلستانِ [سعدی] کا ترجمہ بھی باغِ اردو کے نام سے کیا۔ سیّد حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی لکھی، جو محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ ہے؛ اس کے علاوہ آرایش محفل (قصۂ حاتم طائی)، گلِ مغفرت وغیرہ کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے قصّے کو نثر میں بیان کیا ہے، جس کا نام نثر بے نظیر ہے۔ مظہر علی خان ولا نے ہندی سے بیتال پچیسی کا اردو میں ترجمہ کیا اور اتالیق ہندی وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔ مرزا جان طپش کا بھی تعلّق کالج سے رہا۔ ان کی کتاب شمس البیان فی اصطلاحاتِ ہندوستان قابلِ ذکر ہے۔ طپش نے بہارِ دانش نام کا ایک منظوم عاشقانہ قصّہ بھی لکھا ہے۔ وہ صاحبِ دیوان ہیں۔ کاظم علی جوان نے شکنتلا ناٹک کا اور شیخ حفیظ الدین احمد نے خرد افروز کے نام سے عیار دانش کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ خلیل خان اشک، نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہاں وغیرہ کئی اشخاص کالج سے متعلق تھے۔ گل کرائسٹ نے لغت اور صرف و نحو پر کتابیں لکھیں۔

ایک اَور ادارہ، جس نے اردو زبان اور اُس وقت کے نظامِ تعلیم میں انقلاب پیدا کیا، مرحوم دہلی کالج تھا۔ اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں: ایک یہ کہ یہ پہلی درس گاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور ایک ہی چھت کے نیچے مشرق و مغرب کے علوم و ادب ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا۔ اس کالج سے ایسے روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنّف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور معاشرے پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعۂ تعلیم اردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اردو ہی کے ذریعے پڑھائے جاتے تھے۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلّق ایک مجلس ترجمہ (Translation Society) تھی، جو کالج کے طلبہ کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے یا تالیف کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کی مطبوعات کی تعداد قریب ڈیڑھ سو کے ہے، جو تاریخ، جغرافیہ، اصول، قانون، ریاضیات اور اس کی متعلقہ شاخوں کیمیا، میکانیکیات، فلسفہ، طب، جرّاحی، نباتیات، عضویات، معاشیات وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل تھیں۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا تو یہ کالج ہماری زبان و ادب کی عظیم الشّان خدمت انجام دیتا۔

فورٹ ولیم کالج نے بلاشُبہہ سادہ اردو لکھنا سکھائی، مگر اس کی تقریبًا سب کتابیں قصص و حکایات کے ترجمے ہیں۔ دہلی کالج میں کالج کی جماعتوں کے درس کے لیے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں، جس کا مقصد طلبہ کو مغربی علوم سے روشناس کرنا تھا۔ یہ سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء) تھے جنھوں نے سنجیدہ اور علمی مضامین سادہ اور بے ساختہ زبان میں ادا کرنے کا ڈھنگ ڈالا۔ ان کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ استدلال اور عقلیت کی پختگی ہے۔ وہ ابہام سے بہت بچتے ہیں اور بعض اوقات اپنے خیال کو دل نشین کرنے کے لیے اس قدر سادگی اور وضاحت سے کام لیتے ہیں کہ عبارت بے رنگ ہو جاتی ہے؛ لیکن ان کے کلام میں اثر ہے، جو سادگیِ بیان اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ سرسیّد احمد خان کا شمار ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریروں کا معتد بہ حصّہ ایسا ہے جس میں خوش بیانی، مزاح اور ادبیت کا دل آویز رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے رسالۂ تہذیب الاخلاق نے اردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب خیالات ہی میں نہیں ادائے خیالات کی طرز میں بھی تھا۔ یہ نثر نگاری قدیم نثر نگاری سے جدا تھی، جس کا لازمی جز تصنّع اور آرائش تھا۔ بقول سرسیّد کے جہاں تک ہو سکا سادگیِ عبارت پر توجہ کی۔ اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو صرف مضمون کی ادائگی میں

ہو؛ جو اپنے دل میں ہے وہی دوسرے کے دل میں پڑے کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ یہ نثر نگاری کا کمال ہے۔

اس نوبت پر ہم مرزا غالب کے رقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے، جو زبان کی فصاحت و سلاست، بے ساختگی، مزاح و ظرافت اور دلکش انداز کا بے مثال نمونہ ہیں۔ ان کی مقبولیت ہمارے ادب میں کبھی کم نہ ہوگی۔

وہ بزرگ جن کو جدید اردو کی نثر نگاری میں استادی کا مرتبہ حاصل ہے اور جن کی تصانیف ہمارے ادب میں کلاسکس (Classics) کا درجہ رکھتی ہیں وہ یا تو وہ تھے جو سیّد احمد خان کے زیرِ اثر آ گئے تھے یا وہ جن کی تعلیم قدیم دہلی کالج میں ہوئی تھی۔

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ زبان کے محقّق اور مسجّع نثر کے استاد تھے اور اس کے باوجود کہ وہ بعض اوقات تکلّف اور کہیں کہیں تصنّع سے کام لیتے ہیں وہ اردو نثر کے ایسے صاحبِ طرز ہیں کہ جس کی مثال نہیں۔ ان کی زبان میں غضب کی سادگی، شیرینی اور لطافت ہے۔ ان کا قلم سحر نگار واقعات و حالات کا بیان ایسے پُر معنی، سبک اور لطیف الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھچ جاتا ہے۔ ان کی تصنیف آبِ حیات میں، جو باوجود بعض فنّی اور تاریخی نقائص کے اردو میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، یہ کمال خاص طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں انھوں نے شعرا کی سیرت اور زندگی کے حالات اس خوبی سے بیان کیے ہیں کہ ان کی زندہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں، یعنی نیرنگ خیال، دربار اکبری اور قصص ہند، حصّہ دوم، پڑھنے کے قابل ہیں، وہ نقّاد نہیں، اگرچہ انھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی۔ وہ اس کے اہل نہ تھے۔ ان کی تنقید پرانے تذکرہ نویسوں کی طرح بیان و بدیع کے عیوب و محاسن اور مبہم الفاظ میں ایک قسم کی تقریظ یا تنقیص ہوتی ہے۔ ان کی رائیں ایک طرح سے روایتیں ہیں، جو بزرگوں سے سنی تھیں یا سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھیں۔ ان کی نثر بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں۔

حالی نے جس طرح اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر کے صحیح راستے کی طرف رہنمائی کی اسی طرح اردو نثر پر بھی ان کا کم احسان نہیں۔ نثر ہماری زبانوں (یعنی اردو، فارسی، عربی) میں ایک قسم کی نیم شاعری تھی، یعنی رنگین، مسجّع یا مقفّٰی عبارت ــــ تشبیہوں، استعاروں اور مبالغے سے لدی ہوئی، خیال کم اور لفظوں کی بھرمار، ایک معنی کے لیے کئی کئی مترادف الفاظ۔ جسے صحیح نثر کہنا چاہیے اس کی ابتدا اگرچہ سرسیّد سے ہوئی لیکن حالی نے اس کی بنیادیں مضبوط کیں اور اسے سنوارا۔ حالی کی نثر بڑی جچی تلی، سادہ اور متین ہوتی ہے۔ متین سے میری مراد ایسی نثر سے ہے جس میں جان اور قوّت ہو۔ حالی کے مزاج اور کلام میں اعتدال اور قدیم اساتذہ کا سا ضبط ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے؛ عقلیت اور استدلال کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ رنگین عبارت، جو تشبیہ و استعارہ سے مملو ہوتی ہے، ذہن کو اصل موضوع سے ہٹا کر لفظی صنائع اور آرائش کی طرف لے جاتی ہے اور اصل مضمون کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ ان کی نثر میں الفاظ اور خیالات ایسے یکجان ہوتے ہیں کہ اس سے معنی میں روشنی اور کلام میں قوت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی نثر کی ایک اَور خصوصیت ایجاز ہے۔ پھیلاؤ سے کلام میں ضُعف پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ لفظ کے بہت بڑے نبّاض ہیں۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ حالی جملوں کا کام لفظوں سے لیتے ہیں۔ وہ جملے میں ایسا برمحل لفظ بٹھا دیتے ہیں کہ سارا خیال چمک اٹھتا ہے۔

جدید سوانح نگاری کی بنیاد بھی حالی نے ڈالی۔ اس میں پہلی کتاب جو ان کے قلم سے نکلی وہ حیاتِ سعدی ہے۔ سعدی کی حیات پر فارسی یا اردو میں کوئی سامان نہ تھا۔ صرف شیخ کے کلام کے مطالعے سے شہد کی مکھی کی طرح ذرہ ذرہ چن کر حالی نے سعدی کی سیرت اور اخلاق اور حالات کو مرتّب کیا ہے اور کلام پر مفصّل تبصرہ اور اس کے محاسن اور ادبی نکات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

حالی کی یادگارِ غالب اردو کے عالی مرتبہ شاعر پر پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ اس کے بعد غالب پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن یادگارِ غالب کو پڑھ کر غالب کی عادات و اخلاق، اس کی سیرت اور شخصیت کا جو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے، دوسری کتابیں اس سے قاصر ہیں۔ یادگار نے پہلی مرتبہ غالب کی قدر و منزلت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی اور اس کی سیرت اور کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیوں اور نکات کو اس انداز سے بیان کیا کہ غالب کی شخصیت انسان اور شاعر کی حیثیت سے اس رتبے کو پہنچ گئی جس کا وہ مستحق ہے۔ یادگارِ غالب نے غالب کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔

تیسری کتاب اس موضوع پر حیاتِ جاوید ہے۔ نثر میں حالی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس میں صرف سیّد احمد خان کی سیرت، ان کے حالات اور کارناموں ہی کا ذکر نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدّن کی تاریخ ہے۔ اس میں اس زمانے کی معاشرت، تعلیم، مذہب، سیاست، زبان، نئی تحریکیں اور ان کے اثرات و نتائج سب ہی کچھ آ گیا ہے۔ یہ زمانہ بہت انقلاب انگیز تھا۔ مسلمانوں کی حالت نہایت پست اور درماندہ ہو گئی تھی۔ ان کی اصلاح کے لیے سرسیّد کی مساعی اور جدوجہد، مخالفوں کی یورش، حکومت کی بے التفاتی اور سرد مہری، آپس کے تنازعے یہ سب حالات بہت دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔ ایک ایسے شخص کے حالات کا لکھنا جو ہر طرف سے نرغے میں گھرا ہوا تھا، جو اپنی قوم کے لیے اپنوں اور غیروں سے مجاہدانہ لڑ رہا تھا اور جس کی اصلاح کا موضوع کوئی ایک نہ تھا، بلکہ تعلیم، معاشرت، زبان، مذہب، سیاست سب ہی میں اسے کام کرنا اور دخل دینا پڑتا تھا، حالی ہی کا کام تھا۔ ہماری زبان میں یہ اعلیٰ نمونہ سوانح عمری کا ہے۔ ادبی لحاظ سے بھی اس کتاب کا پایہ نہایت بلند ہے۔

اردو میں جدید تنقید کی ابتدا بھی حالی سے ہوئی۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں شاعری کی ماہیت، حیات و معاشرہ سے اس کا تعلّق، اس کے لوازم، زبان کے بعض اہم مسائل، اردو کی اصناف شاعری اور ان کے عیوب و محاسن اور اصلاح

پر بہت معقول اور مفکّرانہ بحث کی ہے، خاص کر نیچرل شاعری پر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی تنقید نگاری کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کی خوبی کے لیے جن شرائط کو حالی نے لازم قرار دیا ہے ان پر خود بھی عمل کیا۔ تنقید پر یہ پہلی کتاب ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ ادبی تنقید میں حالی کا درجہ امام کا ہے۔ ان کی تنقید نے اردو کے ذوقِ سخن کو بدل دیا۔

مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ - ۱۹۱۲ء) نے قدیم دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ اردو ادب میں ان کا خاص درجہ ہے۔ یہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے جدید طرز پر اردو میں ناول لکھے۔ یہ ناول مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں۔ ان کا پہلا ناول مرآۃ العروس ہے۔ اس کا مقصد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس میں اوسط درجے کے شریف خاندان کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ ہے۔ جب یہ کتاب چھپ کر شائع ہوئی تو بہت مقبول ہوئی اور [اس کے دو کرداروں] اصغری اور اکبری کے نام سگھڑاپے اور پھوڑپن میں ضرب المثل ہو گئے۔ ایک بڑی خوبی اس میں (اور ان کے اکثر دوسرے ناولوں میں) یہ ہے کہ عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو ہو بہو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ عورتیں بھی قائل ہو گئیں۔ ان کا دوسرا ناول بنات النعش اس کتاب کا گویا دوسرا حصّہ ہے۔ توبۃ النصوح کا موضوع ایک خاندان کی دینی اصلاح ہے۔ محصنات میں دو بیویاں کرنے کے مضر اثرات کو بتایا ہے۔ ابن الوقت میں انگریزوں اور انگریزی معاشرت کی بے جا تقلید کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ ان ناولوں کا مقابلہ آج کل کے ترقی یافتہ ناولوں سے نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پہلی کوشش تھی اور ان میں سے بعض ناول بہت مقبول ہوے۔ اُن میں ایک عیب یہ ہے کہ قصّے کے دوران میں بعض اوقات طویل وعظ شروع کر دیتے ہیں، جو کہیں کہیں تو اس مزاح و ظرافت کی بدولت جو مولانا کی فطرت میں تھی یا قصّے کی مناسبت سے نبھ جاتے ہیں لیکن بعض اوقات ان کا پڑھنا اجیرن ہو جاتا ہے۔ ان ناولوں میں اس وقت کے اوسط درجے کے مسلمان شرفا کی گھریلو زندگی کا نقشہ بہت خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ بعض کرداروں کی نگارش میں کمال کیا ہے؛ وہ زندہ اور جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ مرآۃ العروس میں اصغری اور اکبری اور توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کردار بہت پُرلطف اور بے مثل ہے، اور کلیم کا کردار تو قصّے کی جان ہے۔ ان ناولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو زندگی سے کس قدر دل چسپی تھی اور انھوں نے اپنے وقت کے اسلامی معاشرے اور اسلامی خاندانوں کے طرزِ زندگی اور ان کی نفسیات کو کس قدر گہری نظر سے دیکھا ہے اور کیسا سچا نقشہ کھینچا ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان کی سلاست و فصاحت کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو اصل عربی کا زور اور اس کی شان قائم رہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک ضخیم تصنیف الحقوق و الفرائض ہے۔ یہ کتاب ارکانِ اسلام، احکامِ قرآن، اسلامی آداب و اخلاق اور شرعی معلومات کی چھوٹی موٹی انسائیکلوپیڈیا ہے۔ ان کے علاوہ اَور بھی مختلف موضوعات پر ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔

مولانا جیسے اعلیٰ درجے کے ادیب اور انشا پرداز تھے ویسے ہی زبردست مقرّر بھی تھے۔ زبان پر اُن کو حیرت انگیز قدرت تھی۔ ان کے قلم میں بڑا زور تھا۔ مشکل سے مشکل مطالب کو وہ اپنی خاص طرز میں آسانی سے ادا کر دیتے تھے۔ ان کی تحریر میں بلا کی آمد تھی، مگر طبیعت میں ضبط نہ تھا؛ اس لیے بعض اوقات ان کا بیان عامیانہ رنگ اختیار کر لیتا تھا۔

مولانا شبلی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) ان لوگوں میں ہیں جو سرسیّد احمد خان کے اثر اور فیضِ صحبت کی بدولت ایک محدود اور تنگ دائرے سے نکل کر علم و ادب کے وسیع میدان میں آئے۔ انھوں نے اردو زبان میں اسلامی تاریخ کا صحیح ذوق پھیلایا۔ تاریخ میں انھوں نے ''ہیروز آف اسلام'' کا ایک سلسلہ شروع کیا، جس کی ابتداء المأمون سے ہوئی۔ اس سلسلے میں متعدد نامور اسلاف کے سوانح آ گئے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور اور مقبول کتاب الفاروق ہے۔ ان کی آخری تصنیف، جسے ان کا شاہکار سمجھنا چاہیے، سیرت النبیؐ ہے، جو ان کے انتقال کی وجہ سے نا تمام رہ گئی اور جس کی تکمیل بعد میں ان کے فاضل شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے کی۔ اگرچہ وہ یورپی مؤرّخین اور ان کے طرزِ تاریخ نویسی کے بہت ثنا کی ہیں اور اس کی سخت مذمّت کرتے ہیں لیکن انھوں نے یورپی طرزِ تحقیق سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ علاوہ ان مستقل تصانیف کے انھوں نے بے شمار تاریخی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ اس سے پاکستان و ہندوستان کے اردو دان طبقے اور خاص کر مسلمانوں میں تاریخ دانی اور تاریخ نویسی کا شوق پیدا ہو گیا۔

شبلی شاعر بھی ہیں اور شاعرانہ مزاج بھی رکھتے ہیں؛ بڑے سخن سنج اور سخن فہم ہیں۔ حالی کے بعد تنقید نگاری میں انھیں کا نام آتا ہے۔ وہ اس باب میں حالی سے بہت متأثّر ہیں اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ تنقید میں ان کی کتاب موازنۂ انیس و دبیر بہت مشہور ہے۔ شروع میں جو اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ بیان کی ہے وہ ناقص ہے۔ وہ مرثیے کی ابتدا سودا سے کرتے ہیں، قدیم اردو مرثیوں کا انھیں علم نہیں؛ لیکن سودا کے بعد مرثیے میں جو ترقی ہوئی ہے اسے بخوبی بیان کیا ہے۔ تاریخی بحث کے بعد فصاحت، بلاغت، واقعیت، نفسیاتِ انسانی، جذبات، مناظرِ قدرت اور واقعہ نگاری کے مختلف عنوانات قائم کیے ہیں اور ہر ایک کی حقیقت بیان کرنے کے بعد اپنی تائید میں میر انیس کے کلام سے منتخب اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان بیانات کے بعد انیس کی شاعری کو رزمیّہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے مرثیوں میں کہیں کہیں معرکۂ کارزار، لڑائی کے داؤ پیچ، نقاروں کی گونج، پہلوانوں کی مبارزطلبی، تلواروں اور نیزوں کے کرتب دکھائے گئے ہیں، لیکن یہ صرف رزمیہ شاعری کی جھلک ہے۔ حقیقی رزمیّہ شاعری صرف قدیم اردو میں پائی جاتی ہے۔ انیس کی شاعری کے محاسن دکھانے کے بعد آخر میں دبیر سے مقابلہ کیا گیا ہے اور ہم مضمون اشعار یا بند نقل کر کے انیس کے کلام کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔

مولانا [شبلی] کی ایک اَور مشہور اور مقبول تصنیف شعر العجم ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں انھوں نے اس امر پر بحث کی ہے کہ شاعری کیا چیز ہے اور اس کے تحت وہ احساس و ادراک، محاکات، تخییل وغیرہ سے بحث کرتے ہیں۔ شاعری پر یہ بحث جامع اور قابلِ قدر ہے۔ مولانا نے حالی کے بعد تنقید کے سلسلے کو قائم رکھا، اگرچہ وہ اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

آزاد، حالی اور شبلی انگریزی نہیں جانتے تھے، البتہ انگریزی ادب کے متعلق کچھ موٹی موٹی باتیں سن رکھی تھیں۔ اپنی ذہانت اور ذوق کے بل پر انھوں نے اردو ادب کو حقیقت کی راہ دکھائی اور تنقید کا نیا ڈول ڈالا اور اردو ادب کی انھوں نے وہ عظیم الشّان خدمت کی جو انگریزی تعلیم یافتہ بھی نہ کر سکے۔

جدید تنقید نگاروں میں سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ ہیں۔ شروع شروع میں بعض نے جو کچھ لکھا وہ اخذ و ترجمہ اور نقل کی حد سے آگے نہ بڑھا، لیکن بعد کے لکھنے والوں نے تنقید کے فن کو ترقی دی اور مغرب کے اثر سے تنقید کے کئی مذہب بن گئے؛ بعض تأثّراتی ہیں، جن پر رومانیت اور جذباتیت کا غلبہ ہے، بعض انتہا پسند ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تنقید میں اعتدال ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے مغربی زبان اور ادب سے پورا استفادہ کیا تھا، مگر انھوں نے پروفیسر کلیم الدین احمد اور بعض دیگر مغرب زدہ حضرات کی طرح اپنے ادب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا، بلکہ اپنے ادب اور روایات کی برتری کو دکھایا ہے۔ غالب پر ان کی تنقید اس کی شاہد ہے، اگرچہ اس میں بعض اوقات جذباتیت سے مغلوب ہو کر وہ بہت دُور نکل جاتے ہیں۔ نیاز فتح پوری اور فراق گورکھ پوری کی تنقید بھی جذباتیت اور رومانیت سے تعلّق رکھتی ہے۔ نیاز کی تنقید بالکل وجدان و ذوق پر ہے۔ اس سے وہ اس قدر مغلوب ہیں کہ عقل و شعور کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ فراق بھی وجدان و ذوق کے قائل ہیں۔ وہ شاعر یا ادیب کے کلام میں ڈوب کر تنقید لکھتے ہیں اور پورے جوش کے ساتھ کیف آور اور پُر اثر الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں تخلیقی رنگ جھلکتا ہے۔ مجنوں گورکھ پوری کی ابتدائی تنقیدیں تأثّراتی ہیں، مگر بعد میں وہ مارکسی نظریے کی طرف جھکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں گہرے مطالعے پر مبنی ہیں۔

مغرب ہی کے اثر سے ایک جماعت ترقی پسند مصنّفین کی وجود میں آئی۔ ان کی تنقید کی بنیاد مارکسی خیالات پر ہے۔ وہ زندگی اور ادب اور اس کے تمام شعبوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے تنقید کی ایک نئی راہ نکالی اور تنقید کو آگے بڑھایا لیکن ان کی تنقیدیں کلیۃً مادّی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں۔ وہ وجدانی، روحانی، الہامی، ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی نظریّوں کے قائل نہیں۔ سجاد ظہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین وغیرہ اسی جماعت سے تعلّق رکھتے ہیں۔

کچھ اَور نقّاد ہیں، جو نہ زیادہ مغرب زدہ ہیں نہ اشتراکی اور مارکسی نظریے سے مغلوب۔ انھوں نے مغرب کے اثر میں آ کر مشرقی اصول اور تنقید کو ترک نہیں کیا۔ ان کی تنقید میں توازن اور اعتدال ہے، انتہا پسندی نہیں۔ اس جماعت میں ممتاز نام آلِ احمد سرور کا ہے۔ ان کی تنقید حالی کی پیروی میں ہے۔ صلاح الدین احمد، محی الدین زور اور وقار عظیم بھی اسی قسم کے نقّاد ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تنقید میں توازن ہے، اگرچہ وہ مغربی تنقید کے قائل اور اس کے اصولوں پر عامل ہیں، مگر وہ مشرقی روایات سے منحرف نہیں۔ کلیم الدین احمد کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے، لیکن وہ مغرب کے اثر سے اس قدر مغلوب ہیں کہ بعض اوقات حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی رائے بے رُو و رعایت بڑی آزادی اور بے باکی سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی کتاب اردو تنقید پر ایک نظر نے یہ تو کیا کہ ہمارے ادیبوں کو چونکا دیا اور وہ اپنے کاموں کا جائزہ لینے پر آمادہ ہو گئے، لیکن ان کی تنقید یک طرفہ ہے۔ پروفیسر احسن فاروقی بھی اپنے خیالات میں پروفیسر کلیم الدین سے ملتے جلتے ہیں، لیکن وہ اتنے انتہا پسند نہیں، انھوں نے بھی انگریزی ادب کا مطالعہ بڑے غور سے کیا ہے اور اس کا ان پر بہت اثر ہے۔ وہ تنقید میں صحیح اصول سے کام لیتے ہیں اور بے لاگ رائے دیتے ہیں۔

جدید سوانح نویسی اور تنقید کی طرح ناول اور مختصر افسانے کا رواج بھی مغربی اثر کا نتیجہ ہے۔ مولوی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار ہیں، جن کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ - ۱۹۰۲ء) ہیں۔ یہ بالکل دوسرے رنگ کے شخص ہیں۔ مولوی نذیر احمد جس قدر سنجیدہ ہیں یہ اُسی قدر آزاد اور رنگین مزاج ہیں۔ ان کا مشہور ناول فسانۂ آزاد ہے، جو بہت ضخیم ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بہت بے ڈھنگا اور بے ربط ہے، بہت سے اجزا زبردستی داخل کر دیے گئے ہیں، اکثر واقعات غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ہندوستانی معاشرت کے بعض پہلوؤں پر ان کی نظر وسیع ہے۔ وہ بالخصوص لکھنؤ کے معاشرے کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ نوابی درباروں، خاص خاص تہواروں، رسوم و رواج، شادی بیاہ کے ہنگاموں، ناچ رنگ کے جلسوں، بازاروں کی چہل پہل، سرائے کی بھٹیاریوں، چانڈو بازوں، افیونیوں، بانکوں، شُہدوں، طوائفوں کے حالات وہ بڑے مزے سے بیان کرتے ہیں۔ بیگمات کی زبان پر انھیں بڑی قدرت ہے۔ اس ناول کا مشہور مضحک کردار ''خوجی'' ہے، جو ہمارے ادب میں بطور ضرب المثل کے ہو گیا ہے۔ باوجود نقائص اور خامیوں کے یہ کتاب اردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہے۔

نذیر احمد اور سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر کا نمبر آتا ہے۔ ہماری زبان میں ناول کا نام انھیں کی کتابوں کی بدولت مشہور ہوا۔ شرر مؤرّخ ہیں۔ ان کے اکثر ناول تاریخی ہیں۔ ان کے ناولوں سے لوگوں میں تاریخ کے مطالعے کا ذوق ہی پیدا نہیں ہوا اسلامی حمیّت اور جوش بھی نمودار ہوا۔ شرر کو قصّہ کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ پلاٹ بنانا اور سنوارنا بھی جانتے ہیں، لیکن حقیقت نگاری میں ہیٹے ہیں۔ ناولوں کے تاریخی ہیرو، تاریخ کے نامور اور زندہ اشخاص ہیں، لیکن وہ ان کے

ناولوں میں بے جان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ہیرو کے معاملے میں بعض اوقات اس قدر غلو کرتے ہیں کہ وہ غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں میں فردوسِ بریں ایک کامل ناول ہے۔ اس میں کردار نگاری اور مرقع کشی میں شرر نے کمال دکھایا ہے۔ شیخ جودی اور حسین کے کردار اور ان کے مکالمے بہت خوب ہیں اور زندہ رہنے والے ہیں۔ وہ بہت پُرنویس اور زُودنویس تھے، اس لیے خامیوں کا ہونا لازم تھا۔ باوجود خامیوں کے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہماری زبان میں تاریخی ناول نگاری کے بانی تھے۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ان کا نام باقی رہے گا۔

مرزا ہادی رُسوا ذِی علم اور صاحبِ ذوق شخص تھے۔ ان کا ناول امراؤ جان ادا اردو ادب میں ایک خاص اور ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ وہ کردار نگاری اور اردو (پلاٹ) کی ترتیب کے اعتبار سے بہت متوازن اور مربوط ہے اور افراط وتفریط کے عیب سے بری ہے۔ [سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے] حقیقت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ امراؤ جان کا کردار ایک زندہ کردار ہے۔ یہ سارا قصہ بہت اچھی ستھری زبان میں ہے۔

مولانا راشد الخیری دہلوی نے بہت سے ناول عورتوں کی اصلاح و بہبود کے لیے لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے اپنے پھوپھا مولوی نذیر احمد کی پیروی کی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان اور ان کی سیرت بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں اور غم والم اور دردانگیزی کی نگارش میں کمال رکھتے ہیں، اسی لیے مصوّرِ غم کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے بیانات میں آوُرد پائی جاتی ہے اور ناولوں کے اکثر پلاٹ اور مکالمے غیر فطری معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کردار نگاری سے زیادہ انشا پردازی کی طرف مائل ہیں۔ ان کے ناولوں کے کردار اکثر بے جان ہیں، لیکن ایک ظریفانہ کردار نانی عشّو بہت دلچسپ اور زندہ کردار ہے۔

اب تک جتنے ناول نویسوں کا ذکر آیا ہے پریم چند ان سب سے الگ ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں دیہاتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ حقیقت نگاری پریم چند کی بڑی خصوصیت ہے۔ ان کا اندازِ بیان صاف ستھرا اور مشاہدہ وسیع ہے۔ ان کے ناول اصلاحی ہیں۔ ان میں بے کس کسانوں سے ہم دردی کی ہے۔ ان کی روزمرّہ کی زندگی، جھگڑے ٹنٹے، زمینداروں کے جبر واستبداد اور ان کے اقتصادی مسائل کو سچائی سے بیان کیا ہے۔ پریم چند نے متعدد ناول لکھے ہیں، لیکن دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں: ایک میدانِ عمل، جس میں ادنیٰ طبقے کے افلاس اور ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کش مکش کا نقشہ کھینچا ہے؛ دوسرا گئودان، جو اُن کا شاہکار ہے۔ اس میں باپ اور بیٹے، قدیم اور جدید، ظلم اور بغاوت کی کش مکش ہے۔ ان کے کردار بلاشُبہہ جان دار ہیں، لیکن کوئی ایسا کردار پیدا نہیں کر سکے جسے ابدیّت حاصل ہو۔

کچھ اَور ناول نویس بھی ہیں۔ مرزا محمد سعید کا ناول خوابِ ہستی قابلِ ذکر ہے۔ مرزا صاحب صاحبِ فکر اور ادیب ہیں۔ فنونِ لطیفہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ ان میں نفسیاتی نظر بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن [بعض جگہ] طویل تقریریں اور پند و وعظ بھی کرتے جاتے ہیں [ان کا شمار جدید طرزِ ناول نویسی کے بانیوں میں کیا جا سکتا ہے، ان کا ایک اَور ناول یاسمین بھی بہت مقبول ہوا]۔ کشن پرشاد کول کا شیاما ایک ہندو بیوہ کی کہانی ہے۔ یہ اس زمانے کے متوسّط درجے کے ہندو گھرانے کے حالات کا صحیح نقشہ ہے۔

نئے لکھنے والوں میں کرشن چندر، [سعادت حسن منٹو،] اپندر ناتھ اشک، احمد علی، عصمت چغتائی، عزیز احمد قابلِ ذکر ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں ایک طبقہ فرائڈ اور مارکس کے نظریوں سے متأثّر ہے۔ ان ناولوں میں رومانیّت کے ساتھ جنسیّت اور لذتیّت ہے یا اشتراکیّت اور اشتمالیّت کا ہلکا سا رنگ؛ اس کے باوجود یہ ناول مطالعے کے قابل ہیں، کیونکہ ان میں مشاہدے اور حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے اور ان میں سے بعض کا انداز مفکّرانہ ہے، جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

مختصر افسانے کی ابتدا اس صدی کے اوائل میں پریم چند سے ہوئی۔ پریم چند بہت اچھے افسانہ گو اور افسانہ نویس ہیں۔ اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کے دکھ درد، ان کی دل چسپیوں اور مشکلات ومصائب کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقامی رنگ ہے اور مقصد اصلاح ہے۔ اسی زمانے کے لگ بھگ نیاز فتح پوری، سجاد حیدر [یلدرم] اور سلطان حیدر جوش نے بھی افسانے لکھنے شروع کیے۔ نیاز حسن وعشق کے داستان گو ہیں۔ مقامی رنگ اور مقصد سے کوئی واسطہ نہیں۔ سجاد حیدر نے ترکی اور ایرانی افسانوں کے ترجمے کیے اور چند خود بھی لکھے۔ ان کے افسانے عشقیہ ہیں اور رجحان بے قید محبت کی جانب ہے۔ وہ نفسیاتی نظر بھی رکھتے ہیں۔ سلطان حیدر جوش کے افسانے بھی پریم چند کی طرح مقصدی ہیں۔ پریم چند کا مقصد وطن کی محبت ہے اور سلطان حیدر نے اپنے افسانوں میں مغربیت اور اس کے مُضِر اثرات کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس زمانے میں اَور بہت سے افسانہ نویس پیدا ہوے، لیکن قابلِ ذکر صرف چند ہیں، یعنی علی عبّاس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، اعظم کریوی، حامد اللہ افسر وغیرہ۔ یہ لوگ اب رومانیّت کے بجاے زندگی کے حقائق پر نظر ڈالتے ہیں اور پریم چند کی قائم کی ہوئی روایت سے متأثّر ہیں، لیکن یہ نظر بہت گہری نہیں۔ وہ کارزارِ زندگی میں پورے جوش سے نہیں اترتے۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں یو۔پی [ہندوستان] کے مشرقی علاقے کی دیہاتی زندگی کے خاص خاص پہلو اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ مجنوں گورکھ پوری نے یو۔پی کے شرفا اور تعلیم یافتہ طبقے کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ علی عباس حسینی نے یو۔پی کے زمینداروں کی وضع داریوں اور کرتوتوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔ حامد اللہ افسر نے مسلمانوں کی خانگی زندگی کی مخصوص باتیں چُن چُن کے نکالی ہیں۔ غرض ان میں سے ہر ایک جس طرح اپنے ماحول اور اپنے تجربے اور مشاہدے سے متأثّر ہوا ہے اس نے اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

گزشتہ بیس پچیس سال میں غیر زبانوں کے افسانوں کے ترجمے بہت کثرت

سے ہوے۔ انگریزی، روسی، فرانسیسی، ترکی، چینی، جاپانی، ہسپانوی، اطالوی وغیرہ تمام بڑی بڑی زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ان ترجموں کا اثر ہماری افسانہ نگاری پر بہت کچھ ہوا۔ ترجمہ کرنے والوں میں سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنون گورکھ پوری، اعظم کریوی، محمد مجیب، جلیل قدوائی، خواجہ منظور احمد، اختر حسین رائے پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۳۵ء میں دس کہانیوں کا ایک مجموعہ انگارے کے نام سے شائع ہوا، جس میں بڑی بے باکی اور آزادی کا اظہار کیا گیا تھا، بعض کہانیوں میں عام روایات، ظاہر پرستی اور مذہبیّت پر شدید طنز، تضحیک اور تمسخر کیا گیا ہے، جو مبتذل اور عام اخلاق سے گرا ہوا ہے۔ ان میں باغیانہ اور انقلابی رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر بعد کے افسانہ نگاروں پر بھی ہوا۔ اس کے دوسرے سال انجمن ترقی پسند مصنّفین کا قیام عمل میں آیا، جس نے حقیقت پسندی اور آزادی کی تلقین کی اور اردو افسانہ نگاری میں ایک تبدیلی رونما ہوئی؛ چنانچہ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد علی، عصمت چغتائی، بیدی، حسن عسکری، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، ممتاز مفتی، اختر انصاری اور حیات اللہ انصاری وغیرہ نے زندگی کی مختلف پیچیدگیوں اور معاشی پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے بیان میں نفسیاتی جز بھی پایا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور وغیرہ نے بھی بعض افسانے اچھے لکھے ہیں۔ اسی کے ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات نے ہماری جدید شاعری اور تنقید کی طرح افسانے پر بھی اثر ڈالا اور شاید افسانہ ان نظریات سے زیادہ متاثّر ہوا۔ اس سے یہ تو ہوا کہ وسعت پیدا ہوگئی، لیکن بعض افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری اور فن کے نام سے بہت بے اعتدالیاں کی ہیں اور لوگوں کے جذبات اور معتقدات کو مجروح کرنے میں تامّل نہیں کیا۔ بعض نے جنس کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس میں اس قدر غلو کیا ہے کہ عریانی اور لذتیّت صاف نمایاں ہے۔ مثلاً عصمت اور منٹو بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے بعض افسانے درحقیقت اعلیٰ پائے کے ہیں، لیکن چند ایسے افسانے بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں جن کو پڑھ کر گھن آتی ہے اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ پچیس تیس برس میں اردو افسانے نے قابلِ تعریف ترقی کی ہے اور اس کے بعض افسانے ایسے ہیں کہ ہم انھیں دنیا کے مشہور افسانوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد جو نیا دَور آیا ہے اس میں بہت سے نئے نئے افسانہ نویس طبع آزمائی کر رہے ہیں، جن کے متعلّق اس وقت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں رقص و سرُود کو خوب فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۳ء کے لگ بھگ سیّد آغا حسن امانت نے ایک ناٹک اندر سبھا کے نام سے تصنیف کیا۔ اُس میں اس نے ہندی دیو مالا کو اسلامی روایات میں سمو کر خاص کیفیت پیدا کی ہے۔ گانے اور رقص نے اس کی مقبولیت میں اَور اضافہ کیا۔

اسی دوران، یعنی ۱۸۵۳ء میں ڈھاکے اور بمبئی میں اردو سٹیج کا آغاز ہوا۔ ڈھاکے میں ابتدا امانت کی اندر سبھا ہی سے ہوئی۔ شیخ فیض بخش کان پوری نے، جو ایک مدّت سے ڈھاکے میں مقیم تھے، ایک تھیٹریکل کمپنی ''فرحت افزا'' نام سے قائم کی اور نواب علی نقیس کو ڈرامے لکھنے کے لیے بلایا۔ انھوں نے بہت سے ڈرامے لکھے۔ وہاں کے امرا نے اس کی سرپرستی کی۔ اس کمپنی نے بنگال کے مختلف مقامات میں ڈرامے دکھائے، جس کا ایک اثر یہ ہوا کہ بنگال کے ان علاقوں میں جہاں ٹوٹی پھوٹی اردو بولی یا سمجھی جاتی تھی اردو کا شوق پیدا ہو گیا۔

۱۸۵۳ء میں ہندو ڈرامیٹک کور کو، جو مرہٹی ڈرامے دکھاتی تھی، یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک کی عام مقبول زبان اردو میں ڈرامے دکھائے جائیں تو زیادہ رونق اور کامیابی ہو گی؛ چنانچہ اس نے گرانٹ روڈ تھیٹر میں اردو کا ناٹک گوپی چند دکھایا۔ اسی ناٹک کو اس نے دوبارہ جنوری ۱۸۵۴ء میں پیش کیا۔

ہندو ڈرامیٹک کور کے ٹوٹ جانے یا بمبئی سے چلے جانے کے بعد پارسی تھیٹریکل کمپنی نے، جو گجراتی تماشے دکھاتی تھی، اردو کی طرف توجہ کی اور اردو کے کئی ڈرامے دکھائے۔ ڈرامے کے آخر میں نقل دکھانے کی رسم بھی اسی نے جاری کی۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۴ء کے اواخر تک رہا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم نے ملک کا نظم درہم برہم کر دیا تھا۔ ناٹک کمپنیوں پر بھی اوس پڑ گئی، لیکن کچھ ہی عرصے بعد تاجرانہ ذہنیّت کے پارسی سرمایہ داروں نے اس فن کو پھر زندہ کیا اور کاروباری اصول پر چلانے کا ڈول ڈالا۔ سیٹھ پسٹن جی فرام جی نے، جو شاعر بھی تھے اور اداکار بھی، اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ رونق بنارسی اور حسینی میاں ظریف اس کے ڈرامہ نگار اور بالی والا اور کاؤس جی کھٹاؤ اس کے مشہور اداکار تھے۔ اس کمپنی کی بڑی شہرت ہوئی اور اس نے ۱۸۷۷ء میں دہلی دربار کے موقع پر خوب نام پایا۔

پسٹن جی فرام جی کے انتقال کے بعد بالی والا اور کاؤس جی کھٹاؤ نے اپنی الگ الگ کمپنیاں وکٹوریا ناٹک کمپنی اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے نام سے قائم کر لیں۔ الفریڈ کمپنی کے ڈرامہ نگار سیّد مہدی حسن احسن لکھنوی اور بعد میں آغا حشر تھے۔

محمد علی ناخدا نے کھٹاؤ کی الفریڈ کمپنی کے مقابلے میں نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ریاست رام پور کے نواب حامد علی خان اشک نے لاکھوں روپے کے صرف سے رام پور قلعے کے سامنے تھیٹر کی عالی شان عمارت تعمیر کی اور قابل ڈرامہ نگاروں، شاعروں اور اداکاروں کو اپنی کمپنی کے لیے جمع کیا۔ اس کمپنی کے ٹوٹنے پر اس کے عملے نے دہلی میں جوبلی تھیٹر قائم کیا جو بہت مقبول ہوا۔

۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک بیسیوں کمپنیاں بنیں اور ٹوٹیں اور کچھ دن اپنا اپنا تماشا دکھا کر رخصت ہو گئیں۔ سینما نے ان کا بازار سرد کر دیا۔

اگرچہ پارسی سرمایہ داروں نے حصولِ زر کی خاطر اپنا سرمایہ اس کام میں لگایا،

لیکن اس ضمن میں اردو ڈرامے اور اردو زبان کی خدمت بھی ان کمپنیوں نے کی۔

قدیم ڈرامے ابتدا میں اندر سبھا کے انداز کے تھے۔ بعد میں کچھ اصلاح ہوئی، لیکن پھر بھی قدیم روایات کے پابند رہے۔ موضوع عشق و محبت ہوتا تھا؛ کردار اکثر مافوق الفطرت ہوتے؛ حقیقی زندگی سے بہت کم واسطہ ہوتا؛ باتیں گانے میں ہوتیں، بادشاہ بھی گاتا، وزیر بھی گاتا، غلام بھی گاتا؛ اشعار کیا تھے، تُک بندی ہوتی تھی اور بیچ بیچ میں نثر آ جاتی تو نظم سے بدتر؛ مقفّیٰ، مسجّع نیم شاعری ہوتی۔ احسن لکھنوی، بے تاب اور حشر نے کچھ اصلاح کی۔

جدید اردو میں جو ڈرامے لکھے گئے ہیں وہ سٹیج پر آنے کے قابل نہیں، پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان لکھنے والوں میں مرزا ہادی رُسوا، احمد علی شوق، لالہ کنور سین، حکیم احمد شجاع، اشتیاق حسین قریشی، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی، سدرشن، عبدالماجد، کیفی اور ادیب قابلِ ذکر ہیں۔ یورپی ڈراموں کے بھی اردو ترجمے ہوئے؛ ان کا بھی ہمارے ڈرامہ نگاروں پر اثر پڑا۔

آخر میں ان چند اداروں اور انجمنوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اردو کی اشاعت و ترقی اور اس کے علمی مرتبے کو بلند کرنے میں کام کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج، قدیم دہلی کالج کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ سوسائٹی سرسیّد احمد خان نے ۱۸۶۴ء میں قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر اہلِ وطن میں مغربی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے اور علمی مضامین پر لکچر دیے جائیں۔

سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ یہ کتابیں تاریخ، معاشیات (پولیٹیکل اکانومی)، فلاحت، ریاضیات، طبیعیات وغیرہ مضامین کی تھیں۔ اسی سوسائٹی کی جانب سے ایک اخبار [علی گڑھ] انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی جاری کیا گیا، جس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی مضامین شائع ہوتے تھے۔ یہ اخبار سرسیّد کی وفات کے بعد تک جاری رہا۔

انیسویں صدی کے آخر میں مطبع نول کشور نے بھی علاوہ عربی و فارسی تصانیف کے اردو زبان کی بے شمار کتابوں کی طبع و اشاعت کا قابلِ تعریف کام کیا اور نظم و نثر کی ایسی ایسی ضخیم کتابیں چھاپ کر شائع کیں جو کسی دوسرے ادارے یا مطبع کے بس کی بات نہ تھی۔ بیسویں صدی میں جن انجمنوں اور اداروں نے یہ خدمت انجام دی ان میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی، انجمنِ ترقی اردو اور جامعۂ عثمانیہ حیدر آباد دکن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن اور جامعۂ عثمانیہ نے صدہا کتابیں مختلف علوم و فنون کی ترجمہ و تالیف کیں اور ہزارہا اصطلاحاتِ علمیہ وضع کر کے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ انجمن نے اس کے سوا اردو شعرا کے قدیم نایاب تذکرے مرتب کر کے شائع کیے اور اردو زبان کی قدیم کتابیں، جن کے نام تک سے لوگ ناواقف تھے، شائع کر کے اردو زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔ جامعۂ عثمانیہ برِّعظیم پاکستان و ہند میں پہلی یونیورسٹی تھی جس میں تمام علوم و فنون کا ذریعۂ تعلیم ملک کی ایک دیسی زبان، یعنی اردو تھا۔ افسوس کہ ریاست پر قبضے کے بعد یونیورسٹی کا سررشتۂ تالیف و ترجمہ بند کر دیا گیا اور ذریعۂ تعلیم اردو، جو جامعۂ عثمانیہ کی ممتاز خصوصیت اور اس کا بڑا کارنامہ تھا، موقوف کر دیا گیا۔ حیدر آباد دکن میں ہماری قومی زبان اور تہذیب کو جس بے دردی سے مٹایا گیا ہے اس کا صدمہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

تقسیمِ ملک کے بعد حال میں پاکستان میں چند ادارے ایسے قائم ہوئے ہیں جو علمی، ادبی اور ثقافتی کام کر رہے ہیں [مثلاً انجمنِ ترقی اردو پاکستان، مجلسِ ترقی ادب، بزمِ اقبال، اقبال اکیڈمی، ادارۂ مطبوعاتِ فرینکلن، اردو فاؤنڈیشن، حلقۂ اربابِ ذوق، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، اردو اکیڈمی وغیرہ]۔

[اردو ادب کی مختلف اصناف کے تفصیلی جائزے کے لیے دیکھیے مادّہ ہای ڈراما؛ رباعی؛ ریختی؛ حکایت (داستان، ناول اور مختصر افسانہ)؛ غزل؛ قصیدہ؛ قطعہ؛ مرثیہ؛ مثنوی؛ نظمِ جدید؛ نقد ادب؛ واسوخت؛ نیز اردو زبان کی ابتدا اور لسانی مباحث کے لیے دیکھیے مادّۂ زبان اردو]۔

مآخذ: (۱) امیر خسرو: تغلق نامہ (سلسلۂ مخطوطات فارسیہ، حیدر آباد دکن)، طبع انجمنِ ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء؛ (۲) ملک محمد جائسی: اکھروتی (شرح اکھروتی، قلمی)، در کتاب خانۂ راقم؛ (۳) شیخ بہاء الدین باجن: خزائنِ رحمت (قلمی)، در کتاب خانۂ انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی؛ (۴) جمیعات شاھی (قلمی) در کتاب خانۂ راقم؛ (۵) مولانا سیّد مبارک، معروف بہ میر خورد: سیر الاولیاء [مطبوعۂ ملک چنن دین، لاہور، بلا تاریخ]؛ (۶) ملّا وجہی: سب رس، طبع انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۲ء؛ (۷) سلطان محمد قلی قطب شاہ: کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، در رسالۂ اردو، ج ۲، جنوری ۱۹۲۲ء؛ (۸) حافظ محمود شیرانی: پنجاب میں اردو، مطبوعۂ کریمی پریس، لاہور؛ (۹) عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیۂ کرام کا کام، طبع سوم، انجمنِ ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۵۳ء؛ (۱۰) شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی: اخبار الاخیار، مطبوعۂ مسلم پریس، دہلی ۱۳۲۸ھ؛ (۱۱) سیّد محمد اکبر حسینیؒ، فرزند اکبر خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ: جوامع الکلم، مطبوعۂ انتظامی پریس، کان پور ۱۳۵۶ھ؛ (۱۲) میراں جی شمس العشاقؒ، برہان الدین جانمؒ، امین الدین اعلیٰؒ: بیاضِ بیجاپوری (قلمی)، در کتاب خانۂ راقم، سنہ کتابت ۱۰۶۸ھ؛ (۱۳) میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو، طبع انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۴۰ء؛ (۱۴) عبدالحق: ذکرِ میر، طبع انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۲۸ء؛ (۱۵) وہی مؤلف: مقدمۂ گلشن ہند (تصنیف میرزا علی لطف)، لاہور ۱۹۰۶ء؛ (۱۶) محمد حسین آزاد: آب حیات، لاہور ۱۸۸۳ء؛ (۱۷) پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے، در مجلۂ اردو، جنوری ۱۹۳۷ء؛ (۱۸) تاریخِ دکن، حصّہ ۲ و ۳ (سلسلۂ آصفیہ، حیدر آباد دکن)، آگرہ ۱۸۹۷ء؛ (۱۹) نور الحسن ہاشمی: کلیاتِ ولی، بارسوم، انجمنِ ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۴ء؛ (۲۰) رام بابو سکسینہ: تاریخِ ادبِ اردو، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۹ء؛ (۲۱) حالی: حیاتِ جاوید، نامی پریس، لکھنؤ ۱۸۹۳ء؛

(۲۲) وہی مصنف: یادگارِ غالب، کریمی پریس، لاہور ۱۹۳۰ء؛ (۲۳) عبدالحق: مرحوم دہلی کالج، انجمنِ ترقی اردو، طبع دوم، ۱۹۴۵ء؛ (۲۴) حالی: دیوانِ حالی مع مقدمۂ شعر و شاعری، نامی پریس، کان پور ۱۹۰۱ء؛ (۲۵) شبلی نعمانی: شعر العجم، ج ۴، اعظم گڑھ ۱۳۴۱ھ؛ (۲۶) وہی مصنف: موازنۂ انیس و دبیر، لکھنؤ ۱۹۲۴ء؛ (۲۷) ترجمۂ حالی (خودنوشت)، در مقالاتِ حالی، ج ۱، بارسوم، انجمنِ ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۶ء؛ (۲۸) مسدّسِ حالی (مع مقدمہ)، کان پور ۱۹۲۹ء؛ (۲۹) کلام میراں جی شمس العشاق، در اردو، اپریل ۱۹۲۷ء؛ (۳۰) کلام برھان الدین جانم، در اردو، جولائی ۱۹۲۷ء؛ (۳۱) کلام امین الدّین اعلیٰ، در اردو، جنوری ۱۹۲۸ء؛ (۳۲) شاہ میراں حسینی: شرح تمہید بمدانی (شرح – شرح تمہید)، در اردو، اپریل ۱۹۲۸ء؛ (۳۳) شاہ علی جیو گام دھنی، در اردو، جولائی ۱۹۲۸ء؛ (۳۴) میاں خوب محمد چشتی، در اردو، جنوری ۱۹۲۹ء؛ (۳۵) حسن شوقی، در اردو، جولائی ۱۹۲۹ء؛ (۳۶) عبدالحق: چند ہم عصر، طبع چہارم، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۳۷) سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، در اردو، اپریل ۱۹۳۵ء؛ (۳۸) عبدالحق: نصرتی، مطبوعۂ انجمنِ ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن)؛ (۳۹) عبدالرّحمٰن بجنوری: محاسن کلامِ غالب، در اردو، جنوری ۱۹۲۴ء؛ (۴۰) اہل یورپ اور اردو کی خدمات، در اردو، جنوری ۱۹۲۴ء؛ (۴۱) مجلۂ اردو (اقبال نمبر)، اکتوبر ۱۹۳۸ء؛ (۴۲) کلیم الدّین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر، برقی مشین پریس مراد پور، پٹنہ [بلا تاریخ؛ طبع لکھنؤ، مع اضافہ، ۱۹۵۷ء]؛ [(۴۳) سیّد مسعود حسن رضوی: بہاری شاعری، طبع پنجم، لکھنؤ ۱۹۵۳ء؛] (۴۴) محمد احسن فاروقی: اردو میں تنقید، لکھنؤ ۱۹۵۵ء؛ (۴۵) عبادت بریلوی: اردو تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۱ء؛ [(۴۶) محی الدّین قادری زور: اردو کے اسالیب بیان، ۱۹۲۷ء؛ (۴۷) وہی مصنّف: اردو شاہ پارے، ۱۹۲۹ء]؛ (۴۸) محمد عبدالجبار خان: محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۹ھ؛ (۴۹) انشاء اللہ خان انشا: دریائے لطافت، مطبوعۂ انجمنِ ترقی اردو، ۱۹۳۵ء؛ (۵۰) محمد عمر و نور الٰہی: ہندوستان کا ڈراما، در مجلہ اردو، جنوری و جولائی ۱۹۲۴ء؛ (۵۱) نصیر الدین ہاشمی: دکن میں اردو، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۵۲) وہی مصنّف: یورپ میں دکنی مخطوطات، حیدرآباد (دکن) ۱۹۳۲ء؛ (۵۳) سیّد ہاشمی فرید آبادی: تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، مطبوعۂ انجمنِ ترقی اردو، کراچی ۱۹۵۲ – ۱۹۵۳ء؛ (۵۴) سیّد علی عباس حسینی: ناول کی تاریخ و تنقید؛ (۵۵) محمد احسن فاروقی: ناول کیا ھے؟ لکھنؤ ۱۹۴۸ء؛ (۵۶) وقار عظیم: بہارے افسانے، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۵۷) عبدالحلیم نامی: اردو تھیٹر (مقالۂ ڈاکٹریٹ، غیر مطبوعہ)؛ (۵۸) عشرت رحمانی: اردو ڈراما (تاریخ و تنقید)، لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۵۹) رسالۂ ادب لطیف، لاہور، ڈراما نمبر، ج ۳۹، شمارہ ۱؛ (۶۰) رسالۂ آج کل، دہلی، ڈراما نمبر، جنوری ۱۹۵۵ء؛ [(۶۱) سیّد مسعود حسین رضوی ادیب: لکھنؤ کا شاہی اسٹیج، ادبستان، لکھنؤ ۱۹۶۱ء؛ (۶۲) وہی مصنّف: لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، ادبستان، لکھنؤ ۱۹۶۱ء؛] (۶۳) گریئرسن (G. Grierson): *Linguistic Survey of India*، ج ۱ و ۹ (حصّہ ۱)؛ (۶۴) گارسان دتاسی (Garcin de Tassy): *Histoire de la Littérature*، طبع دوم، تین جلد، ۱۸۷۰ء؛ (۶۵) گراہم بیلی (T. Grahame Bailey): *A Short History of Urdu Literature*، اوکسفرڈ ۱۹۳۱ء؛ (۶۶) تاراچند: *Problem of Hindustani*، ۱۹۴۴ء؛ (۶۷) انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (طبع ثانی)، بذیل مادّۂ *Hindustani Language and Literature*؛ (۶۸) Latif: *Influence of English on Urdu Literature*، لنڈن ۱۹۲۴ء.

(عبدالحق)

اَرْدِی بہشت: رک بہ مادّۂ تاریخ. *

اَرَرَ: رک بہ مادّۂ ھَرَر. *

اَرَرات: رک بہ مادّۂ جبل الحارث. *

اَرّان: یہ نام عہدِ اسلامی میں ماورائے قفقاز کے اس علاقے کے لیے * استعمال ہوتا تھا جو دو دریاؤں کُر (کُرہ) اور اَرَس (اَرَکْس) کے درمیان واقع ہے۔ زمانۂ قبل اسلام میں یہ اصطلاح ماورائے قفقاز کے تمام مشرقی علاقے (موجودہ سوویٹ آذربیجان)، یعنی کلاسیکی البانیا (قب مقالۂ البانیا، در Pauly-Wissowa) کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ پندرھویں صدی عیسوی تک اَرّان کا نام بول چال میں مستعمل نہ رہا، کیونکہ یہ سارا علاقہ آذربیجان میں مدغم ہو چکا تھا.

اس کے نام اَرّان ــــ جارجی: Rani، یونانی: Αλβανοι اور ارمنی: ‘Alwank (لوگ) ــــ کی اصلیت معلوم نہیں۔ (بعض کلاسیکی مصنّفین کے ہاں البتہ ایرین (Arian) یا آرین (Āryan) شکلیں ملتی ہیں اور عربی مآخذ میں شکل الرّان ملتی ہے)۔ ۳۸۷ء سے پہلے ان دو دریاؤں کے بیچ کا علاقہ اَرمینیہ کا حصہ سمجھا جاتا تھا جس میں اَرْدزَخ (Ardzakh)، اوٹی (Uti) اور پَعَیْتہ کَرَن (P‘aitakaran) کے صوبے شامل تھے۔ ۳۸۷ء میں یونانیوں اور ساسانیوں میں اَرمینیہ کے صوبے کی تقسیم کے بعد پہلے دو صوبے تو البانیا اَرّان کے قبضے میں چلے گئے اور مؤخّر الذّکر ایران میں شامل ہو گیا۔ اَرّان کے نام میں بہت کچھ التباس اور الجھن پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی، اس لیے کہ اَرمنی لوگ صرف اس خطّۂ ملک کو اَرّان کہتے تھے جو دریائے کُر کے شمال میں واقع تھا.

ساتویں صدی عیسوی تک اَرّان کبیر کی آبادی پوری طرح مخلوط ہو چکی تھی اور یہاں کی کسی خاص قوم یا قبیلے کا ذکر کرنا گونہ مشکل ہے۔ الاِصْطَخْرِی، ص ۱۹۲، اور ابن حَوْقَل، ص ۳۴۹، البتہ ایک زبان الرّانیہ کا ذکر کرتے ہیں جو دسویں صدی میں بَرْذَعَہ کے شہر میں بولی جاتی تھی.

عربوں نے اَرمینیہ کے رومن طریقِ تسمیہ کو اختیار کر لیا اور اس اصطلاح کو

وسعت دے کر مشرقی ماورائے قفقاز کے تمام علاقے کو ارمینیہ اوّل کے تحت میں شامل کر لیا، (ابن خرّداذبہ، ص ۱۲۲؛ البلاذری، ص ۱۹۴)۔ جب عرب اس ملک میں وارد ہوے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے تعلقہ داروں میں تقسیم ہے، جن میں سے بعض خزر کے باج گزار بن گئے تھے، بالخصوص ساسانیوں کے زوال کے بعد۔ ارّان میں عیسائیت کی تبلیغ ارمینیہ سے ہوئی اور اموی عہدِ خلافت میں وہ برائے نام طور پر ارمنی شہزادوں کے زیرِ حکومت تھا، جو خود عربوں کے ماتحت تھے۔ چونکہ ارّان اسلامی سرحد پر واقع تھا اور خزروں کے تاخت وتسلّط کی آماج گاہ تھا لہٰذا ارّان کو بہت حد تک آزادی حاصل تھی۔ [حضرت] عمرؓ کی خلافت کے خاتمے اور [حضرت] عثمانؓ کے عہد کی ابتدا میں جو حملے سلمان بن ربیعہ اور حبیب بن مَسْلَمہ کے زیرِ قیادت ہوے ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارّان کے بڑے بڑے شہر، یعنی بَیْلَقان، بَرْذَعہ، قَبَلَہ اور شَمْکُور برائے نام طور پر [عربوں کے] مطیع ومنقاد ہو گئے۔ اس کے بعد عرب متواتر خزروں اور مقامی شہزادوں سے برسرِ پیکار رہے (البلاذری، ص ۲۱۳؛ الطبری، ۱:۲۸۸۹-۲۸۹۱)۔

پہلی خانہ جنگی کے بعد نیز امیر معاویہؓ کے عہد میں ارّان میں عربوں کی حکومت مستحکم ہو گئی، لیکن کوہستان قفقاز کے جنوبی علاقے میں خزروں کے حملے جاری رہے۔ عبدالملک کے عہدِ خلافت میں ارّان کے کلیسا کو، جو اب تک یونانی مسیحی کلیسا سے منسلک رہا تھا، ارمنی پادریوں نے عربوں کی تائید اور رضامندی سے ارمنی کلیسا کے ساتھ ملحق کر دیا (قب J. Muyldermans: *La domination arabe en Arménie*، لووین (Louvain) ۱۹۲۷ء، ص ۹۹)۔ ارمینیہ (بشمولِ ارّان) کے والیوں کے متعلق (قب البلاذری، ص ۲۰۵ - ۲۰۹)۔ مسلمہ بن عبدالملک کے عہدِ ولایت میں، جسے خلیفہ ہشام نے ۱۰۷ھ/ ۷۲۵-۷۲۶ء میں مقرر کیا تھا، ارّان میں عرب قلعہ نشین فوجیں بڑی تعداد میں لائی گئیں اور برذعہ خزروں کے خلاف فوجی کارروائیوں کا مرکز بن گیا۔ خزروں کے خلاف فوج کشی کے لیے دیکھیے D. M. Dunlop: *The History of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۴ء، ص ۶۰-۸۷ و F. Gabrieli: *Il Califfato di Hisham*، اسکندریہ ۱۹۳۵ء، ص ۷۴-۸۴۔ مروان بن محمد کے عہدِ ولایت میں، جو [بعد میں] امویوں کا آخری خلیفہ ہوا (۱۱۳-۱۲۶ھ/ ۷۳۱-۷۴۴ء) خزروں کو فیصلہ کن شکست ہوئی اور عربوں کی حکومت مضبوطی سے قائم ہو گئی۔

ارّان میں اموی اور عباسی دَورِ حکومت میں مقامی اَرّانی اور ارمنی خاندان نیم خودمختارانہ طور پر عربوں کے ماتحت حکمرانی کرتے رہے۔ لگان اسلامی سکّوں میں ادا کیے جاتے تھے اور ہمیں ایک ایسی ٹکسال کا علم ہے جہاں کے بنے ہوے ۱۴۵ھ/ ۷۶۲ء کے قدیم عباسی سکّوں پر اَرّان کا نام موجود ہے۔ یہ ٹکسال یا تو بَرْذَعہ میں واقع تھی یا بیلقان میں۔ ۲۰۷ھ/ ۸۲۲ء میں آ کر ہمیں ایسے سکّے بھی ملتے ہیں جن پر ''مدینۃ اَرّان'' کندہ ہے؛ بظاہر ۲۲۶ھ/ ۸۴۰ء کے بعد اس ٹکسال کو ترک کر دیا گیا۔

عرب مقامی حکمران کو، جو مِہران کے قدیم خاندان سے تھا، بَطْرِیقِ اَرّان کے لقب سے یاد کرتے تھے اور یہاں کا آخری بطریق Varaz Trdat ۸۲۱ یا ۸۲۲ء میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی دریاے کُر کے شمالی علاقے میں واقع شَکّی کے امیر سَہْل بن سُنْباط نے اَرّان کے تمام صوبے پر اپنا تسلّط جما لیا اور خلافتِ اسلامی سے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس نے باغی بابک کو، جس نے اس کے پاس پناہ لی تھی، عربوں کے حوالے کر کے ان سے دوبارہ مصالحت کر لی۔ اس کے کچھ دیر بعد جب نئے گورنر بُغا نے کئی مقامی شہزادوں کو جلاوطن کیا تو اسے یا اس کے بیٹے اور جانشین کو ۸۵۴ء کے قریب سامرّا بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں شَرْوان اور دربند کے امرا نے اَرّان کے معاملات میں مداخلت کی، لیکن بنوساج اَرّان میں سب سے زیادہ طاقت ور حکمران تھے۔

نویں اور دسویں صدی کے آخر کے ساجی والی ماورائے قفقاز کی عیسائی آبادی کے ساتھ بالخصوص سختی برتتے تھے، لیکن مقامی خاندان، خاص طور پر دریاے کُر کے شمال میں، برابر حکومت کرتے رہے (قب ابن حَوقل، ص ۳۴۸)۔ مَرْزُبان بن محمد مُسافر نے اَرّان اور آذربیجان پر ۹۴۱ء سے ۹۵۷ء تک حکومت کی اور اَرّان کے بیشتر امرا اس کے باج گزار تھے۔ ۹۴۳ء میں اسی کے عہدِ حکومت میں روسیوں نے بَرْذَعہ کے مضافات کو تاخت وتاراج کیا تھا۔ اس کے بعد اَرّان گنجہ کے بنوشدّاد کے قبضے میں آ گیا۔ شدّادی خاندان کا سب سے زیادہ طاقت ور رکن ابوالاَسْوار شاوُر بن فضل بن محمد بن شدّاد تھا، جس نے ۴۴۱ھ/ ۱۰۴۹ء سے ۴۵۹ھ/ ۱۰۶۷ء تک حکومت کی۔ ۴۶۸ھ/ ۱۰۷۵ء میں آلپ آرسلان نے اپنے ایک سپہ سالار سُوتِگین کو بنوشدّاد کی جگہ اَرّان کا حاکم بنا کر بھیجا۔ ترکی قبائل، جن میں سب سے پہلے غُزّ تھے، اَرّان میں آ بسے اور رفتہ رفتہ ترکی زبان نے ان سب دوسری زبانوں کی جگہ لے لی جو عام طور پر رائج تھیں۔

ترکی عہد میں بظاہر بَرْذَعہ کی جگہ بیلقان اَرّان کا سب سے اہم شہر بن گیا، لیکن ۱۲۲۱ء میں مغلوں نے اسے تباہ کر دیا۔ اس کے بعد اَرّان کا اہم ترین شہر گنجہ تھا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں اَرّان کو آذربیجان کے ساتھ شامل کر لیا گیا اور ان دونوں صوبوں پر ایک ہی گورنر حکومت کرتا تھا۔ مغلوں کے حملے کے بعد تبلیغِ اسلام اور ترکی تہذیب کی اشاعت کا کام پہلے کی نسبت تیز ہو گیا اور دونوں دریاؤں کے بیچ کے علاقے کا نام قرہ باغ ہو گیا۔ تیمور کی فتوحات کے بعد، جس نے تعمیر اور نہروں کی مرمّت کا بڑا کام کیا، اَرّان کا نام صرف ایک یادِ رفتہ کے طور باقی رہ گیا، کیونکہ اس کے تمام معاملات اب آذربیجان کی تاریخ کا جز ہو کر رہ گئے۔

مآخذ: (۱) اَرّانیوں کی مذہبی تاریخ Moses Kalankatuaci نے ارمنی زبان میں بیان کی ہے (تفلس ۱۹۱۲ء)؛ اس کے مضامین کے لیے قب A. Manandian: *Beiträge zur albanischen Geschichte*، لائپزگ ۱۸۹۷ء، ص ۴۸؛ (۲) قبلِ اسلام کی تاریخ کے لیے قب J. Marquart: *Ērānšahr*، ص ۱۱۷؛ (۳) جغرافیے کے لیے قب لی سٹرینج (Le Strange): ص ۱۷۶-۱۷۹ اور (۴) حدود

العالم، ص ۳۹۸ - ۴۰۳؛ (۵) ارّان کے ابتدائی دور کی اسلامی تاریخ کے متعلق دیکھیے J. Laurent: *L'Arménie entre Byzance et l'Islam*، (پیرس ۱۹۱۹ء)؛ (۶) سَہْل بن سُنْباط کے لیے دیکھیے مِنُورسکی (Minorsky): *Caucasica IV*، در *BSOAS*، ۱۹۵۳ء، ص ۵۰۴-۵۲۹؛ (۷) بنوشدّاد کے متعلق قب اس کی تصنیف *Studies in Caucasian History*، لنڈن ۱۹۵۳ء؛ (۸) اصطلاح و زبان سے متعلق بہت سی تفصیلات مقالۂ ارّان، از زکی ولیدی طوغان، در آ ت، میں مل سکیں گی۔

(فرائی R. N. FRYE)

---

* **اَرَّجان**: فارس کا ایک شہر، عرب مصنّفین کے قول کے مطابق اس شہر کا بانی ساسانی بادشاہ قَوَاذ اوّل (۴۸۸ یا ۴۹۶ - ۵۳۱ء) تھا، جس نے آمِد (دیارِ بکر) اور میّا فارقین کے اسیرانِ جنگ کو یہاں آباد کیا اور اس شہر کا سرکاری نام "وِہ آمِدِ قَوَاذ" (اچھا یا بہتر آمِد قَوَاذ) رکھا اور ان الفاظ کو ملا کر اس کی معرّب شکل "وام قُباذ" یا عموماً محض "آمِد - قُباذ" بن گئی (Marquart نے اس لفظ کو الطبری، ۱: ۸۸۷، ۸۸۸، میں اسی طرح تلفّظ کرنے کی تجویز کی تھی)۔ کچھ عرب مصنّفین نے غلطی سے ارّجان کو "اَبَر (ز) قُباذ" کا نام دے دیا ہے، حالانکہ وہ ایک ضلع اور شہر کا نام ہے، جو اَہْوَاز (خُوزِستان) کی مغربی سرحد پر واقع تھا، نیز دیکھیے مادّۂ اَبَرقُباذ۔ بہرحال یہ نام، یعنی ارّجان، جو عام طور پر استعمال ہوتا ہے، ایک قدیم تر شہر کے نام سے لیا گیا ہے، جو قَوَاذ کے بسائے ہوئے نئے شہر سے پہلے موجود تھا۔

عربی حکومت کے عہدِ اوسط میں فارس کے ایک سرحدی شہر کے طور پر اَہْوَاز کے مقابلے میں ارّجان کا ذکر زیادہ کثرت سے آیا ہے اور وہ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے آخر تک فارس کے پانچ صوبوں میں سب سے مغربی صوبے کا صدر مقام رہا۔ ارّجان کے صوبے کا ایک حصّہ ابتدا میں فارس کا نہیں بلکہ خوزستان کا جز تھا (قب ابن الفقیہ، ص ۱۹۹؛ اَلْمَقْدِسی، ص ۴۲۱)۔ عرب جغرافیہ دان ارّجان کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ایک بہت بڑا شہر تھا، اس کے بازار نہایت عمدہ تھے، یہاں صابن بڑی مقدار میں بنتا تھا، اناج کثرت سے پیدا ہوتا تھا، کھجور اور زیتون کے باغ یہاں بہت زیادہ تھے اور اس کی جاے وقوع گَرْم سِیْر علاقے میں سب سے زیادہ صحت افزا جگہوں میں سے تھی۔ حشیشیین کا عروج اس شہر کے زوال کا باعث بن گیا، کیونکہ انھوں نے کئی ایسے مستحکم مقامات پر قبضہ کر لیا جو آس پاس کی پہاڑیوں پر واقع تھے اور وہاں سے وہ شہر اور اس کے مضافات میں اکثر لوٹ مار برپا کرتے رہتے تھے۔ آخر کار ساتویں/تیرھویں صدی میں انھوں نے ارّجان پر قبضہ کر لیا اور اس فتح کے خوف ناک نتائج سے ارّجان کو پھر کبھی نجات نہ مل سکی۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر قریب کے شہر بِہْبَہان میں منتقل ہو گئے، جو بعد میں ارّجان کی جگہ اس صوبے کا دارالحکومت بن گیا۔

عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک ارّجان اس سڑک پر جو شیراز سے عراق کو جاتی ہے اَہْواز اور شیراز سے تقریباً سترہ میل کے فاصلے پر اور خلیج فارس سے کوئی ایک دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ شہر دریاے طاب کے کنارے پر آباد تھا، جو یہاں اَہْواز اور فارس کے درمیان حدِّ فاصل بناتا تھا۔

ارّجان کے آثارِ قدیمہ C. De Bode نے دریاے طاب (موجودہ آبِ کُرْدِستان یا مارُوْن) کے کنارے پر ۳۱ درجہ ۴۰ ثانیہ عرض بلد شمالی، ۵۰ درجہ ۲۰ ثانیہ طول بلد مشرقی (گرینچ) پر دریافت کیے تھے۔ المستوفی بیان کرتا ہے کہ اس شہر کے لیے اَرْغان یا اَرْخان کا نام آٹھویں/چودھویں صدی میں عام طور سے رائج تھا۔ بقول ہرزفِلْٹ (Herzfeld) اس شہر کے آثار کا محلِّ وقوع بِہْبَہان کے شہر سے بجانب مشرق گھوڑے کی سواری کے ذریعے کوئی دو گھنٹے کا راستہ ہے اور اس نہر کے کنارے ہے جو دریاے مارُون سے نکالی گئی ہے۔ یہ شکستہ آثار تقریباً ایک مستطیل میدان میں کوہ بِہْبَہان کے نزدیک کم و بیش ۳۹۳۰ x ۲۶۲۰ فٹ کے رقبے میں موجود ہیں۔ بقول سٹائن (Stein) کھیتوں نے اب سب عمارتوں کے آثار محو کر دیے ہیں، دریا سے اوپر کی طرف، کوئی دو میل کے فاصلے پر، قرونِ وسطٰی کے زمانے کا ایک پل اور پل سے نیچے ایک بند کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس پُل کا ذکر عرب جغرافیہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۱۹۳ - ۱۹۵؛ (۲) لی سٹرینج (Le Strange)، ص ۲۴۷، ۲۶۸ - ۲۷۰؛ (۳) نوَلدِکہ (Th. Nöldeke): *Gesch. d. Perser u. Araber zur Zeit der Sasaniden*، ص ۱۳، ۱۳۸، ۱۴۶؛ (۴) J. Marquart: *Ērānšahr. n. d. Geogr. d. Pseudo Moses-Xorenac'i*، ص ۴۱ بعد؛ (۵) Schwarz: *Iran*، ۱: ۲ بعد، ۵ بعد؛ (۶) رِٹّر (K. Ritter): *Erdkunde*، ۹: ۱۳۶، ۱۴۵؛ (۷) C. de Bode: *Travels in Luristan and Arabistan*، لنڈن ۱۸۴۵ء، ۱: ۲۹۵ بعد؛ (۸) E. Herzfeld، در *Petermann's Georgr. Mitteil*، ۱۹۰۷ء، ص ۸۱-۸۲؛ (۹) وہی مصنّف، در *Klio*، ۸: ۸؛ (۱۰) Sir Aurel Stein: *Old Routes in Western Irān*، لنڈن ۱۹۴۰ء، ص ۸۰-۸۷، لوحہ (پلیٹ) ۲۲-۲۴۔

(M. STRECK و [D. N. WILBER])

---

* **اَرَّجانی**: ناصح الدّین ابوبکر احمد بن محمد الأنصاری، عرب شاعر، جو ۴۶۰ھ/ ۱۰۶۷ء میں ارّجان میں پیدا ہوا اور ۵۴۴ھ/ ۱۱۴۹ - ۱۱۵۰ء میں تُسْتَر یا عَسْکَر مُکْرَم میں فوت ہوا۔ مذہبی مطالعات کی بنا پر جن کی تکمیل اس نے زیادہ تر اصفہان کے مدرسۂ نظامیہ میں کی تھی، اسے تُسْتَر کا قاضی نامزد کر دیا گیا، لیکن اس نے ابتدا ہی سے اپنے آپ کو شاعری کے لیے وقف کر دیا، جسے وہ کسبِ معاش کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا اور اس نے بالخصوص عباسی خلیفہ اَلْمُسْتَظْہِر کی شان میں مدحیہ نظمیں لکھیں، جو قصیدے کی شکل میں تھیں اور جن کے ساتھ روایتی نسیب [غزلیہ تمہید] بھی شامل تھی۔ گو بعض نقّاد ارّجانی کے کلام کی تعریف کرتے ہیں، تاہم اسے محض

ایک محدود پائے کا شعر گو سمجھنا چاہیے۔ اس کا دیوان، جسے اس کے بیٹے نے مرتّب کیا تھا، ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں بیروت میں شائع ہوا؛ اس کے کئی قلمی نسخے لنڈن اور قاہرہ میں موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن الشَّجَری: حَماسة، حیدر آباد ۱۳۴۵ء، ص ۲۸۳؛ (۲) السَّمْعانی: الانساب، ص ۲۴ الف؛ (۳) ابن الجوزی: المُنْتَظم، حیدر آباد ۱۳۵۹ھ، ۱۰: ۱۳۹ - ۱۴۰؛ (۴) یاقوت، ۱: ۱۹۳ - ۱۹۵؛ (۵) ابن الأثیر، ۱۱: ۹۶ - ۹۷؛ (۶) ابن خَلِّکان، مطبوعہ ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء، ۱: ۸۳ - ۸۵؛ (۷) براکلمان (Brockelmann): تکملہ، ۱: ۴۴۸؛ (۸) علی آل طاہر: *La Poésie arabe en Irak et en Perse sous les Seldjoukides*، مقالۂ سوربون (Sorbonne)، ۱۹۵۴ء، اشاریہ۔

(ادارہ)

✱ **اَرْزَ چیل:** (Arzachel) رکّ بہ الزّرقالی۔

✱ **اِرْزُروم:** Erzerum، اس سطح مرتفع پر جہاں سے قَراصُو یا مغربی فرات نکلتا ہے ترکی اَرمینیہ میں ایک ولایت کا صدر مقام، سطح سمندر سے تقریبًا ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور روسی ماورائے قفقاز (قارص kars) اور ایران (تبریز) سے شمالی ایشیائے کوچک (سِواس) جانے کا واحد قدرتی دروازہ ہے؛ علاوہ ازیں ایک عمدہ سڑک کے ذریعے شمال کی سمت میں بحیرۂ اسود (طرابزُون) اور جنوب میں جھیل وان سے ملا ہوا ہے۔ قدیم زمانے میں بھی عین اسی مقام پر، جو جنگی اور تجارتی اعتبار سے اس قدر اہم ہے، ایک بڑا شہر، یعنی بوزنطیوں کا Theodosiopolis (دیکھیے Chapot: *La Frontiére de l' Euphrate*، ص ۳۶۱) واقع تھا، جو ارمن ضلع کَرِین (Karīn)، کرنوئی کلک (Karnoi Kalak) کا صدر مقام تھا۔ یہ اُس نام میں باقی رہ گیا ہے جس سے عربوں نے اس شہر اور ضلع کو موسوم کیا، یعنی قالیقَلا (اس کے متعلّق قبّ Andreas، در ہارٹمان (M. Hartmann): *Bohtān*، ص ۱۴۴ ببعد؛ Hübschmann، در .*Indogerm. Forsch*، ۱۶: ۲۸۷ ببعد۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ حبیب بن مَسْلَمَہ نے ۶۴۵ - ۶۴۶ھ میں قالیقَلا پر قبضہ کیا، لیکن ارمن مآخذ کی رُو سے یہ قبضہ ۶۵۳ھ کے بعد ہوا (دیکھیے Ghazarian: *Armenien unter der arab. Herrschaft*، ص ۱۹، ۳۳ ببعد، ۷۳)۔ بوزنطیوں اور عربوں کی باہمی جنگوں اور ارمنوں سے لڑائیوں کے متعلّق، جو بعد کی صدیوں میں ہوتی رہیں اور جن کے دوران میں قالیقَلا ایک فریق سے دوسرے کے پاس منتقل ہوتا رہا، قبّ مادّۂ اَرمینیہ۔

اس شہر کا موجودہ نام صرف نویں صدی ہجری سے رائج ہوا۔ ۱۰۴۹ء میں سلجوقیوں نے اَرزن کے شہر کو، جو کرین سے مشرق کی طرف کچھ زیادہ فاصلے پر واقع نہیں ہے، تباہ کر دیا اور اس کی آبادی Theodosiopolis، یعنی قالیقَلا، میں منتقل ہو گئی اور ان لوگوں نے اس شہر کو ارزان الرّوم (رومیوں کا اَرْزن) کے نام سے موسوم کیا، جو بگڑ کر اَرْزُالرُّوم اور اَرْضُ الرُّوم (رومیوں کی سرزمین) ہو گیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی سلجوقیوں نے آخر کار ارمینیہ میں بوزنطی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۲ء سے ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ء تک اَرْزن الرّوم ایک خود مختار سلجوق سلطنت رہا (قبّ مادّۂ طُغرِل شاہ)۔ ۶۴۱ھ میں ارزروم مغول حملے کی لپیٹ میں آ گیا۔ المُسْتَوفی (چودھویں صدی کے پہلے نصف میں) اس شہر میں متعدد گرجاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر ارمن آباد تھے۔ اس کے برعکس ابن بطّوطہ نے آبادی میں ترکمان قبیلوں کا غلبہ دیکھا اور بقول اس کے ان کی حرکتیں شہر کی تباہی کا باعث ہوئیں۔ اس وقت سے ارزروم کا ضلع آق قویُونلو قبیلے کا ایک مضبوط گڑھ بنا رہا۔ قرہ قویُونلو سے جنگوں کے بعد، جو تیمور کے حملے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں، اُوزون حسن نے، جو آق قویُونلو قبیلے کا سب سے بڑا آدمی ہوا ہے، ارزروم کا قلعہ تعمیر کیا، لیکن اپنی وفات سے پہلے ۸۷۸ھ/۱۴۷۳ء میں ترجان کی تباہ کن جنگ کے بعد وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر سلطان محمد ثانی کے قبضے میں آ گیا؛ اب ارزروم ترکی سلطنت کے صوبوں (pashaliks) میں سب سے زیادہ اہم صوبے کا مرکز بن گیا۔ وہ ایک ایسا سرحدی مورچہ تھا جس پر قبضے کے لیے ترکوں کے حریف ایرانی اکثر اُن سے جھگڑتے رہے، لیکن جس پر ترکوں نے ہمیشہ کامیابی سے اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ ترکی کی اندرونی تاریخ میں یہ مقام آبازہ پاشا [رکّ بآن] کی بغاوت کے باعث مشہور ہے، جسے ۱۶۲۷ء میں فرو کیا گیا۔ انیسویں صدی سے اس قلعے کو رُوس کے خلاف ترکی سرحد کا بچاؤ کرنا پڑا ہے، اگرچہ یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کام کو وہ کچھ کامیابی سے نہیں نباہ سکا۔ ۱۸۸۷ء میں دِوِہ بویُون (Dewe Boyūn) [رکّ بآن] کی جنگ کے بعد ارزروم ترکوں کے ہاتھ سے اس طرح نکل گیا کہ اس پر دوبارہ قبضہ کرنا اُن کے لیے ممکن نہ ہوا۔ لیکن اسے عارضی صلح کے بعد ہی روسیوں کے حوالے کیا گیا۔ [۱۸۷۸ء کے بعد سے ارزروم کا نظم و نسق زیادہ تر دُوَلِ یورپ کے ہاتھ میں رہا اور ارمنی وہاں فتنہ و فساد برپا کرتے رہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں روسی فوج ۱۹۱۶ء میں ارزروم میں داخل ہو گئی، لیکن بَرِسْٹ لِتُوؤسْک (Brest-Litovsk) کے معاہدے کے بعد ترک پھر اس پر قابض ہو گئے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں مصطفٰی کمال پاشا تیسری ترک فوج کے مفتّش کی حیثیت سے ارزروم آئے اور پھر فوج سے مستعفی ہو کر انھوں نے یہاں اپنے طور پر ایک مجلسِ ملّی کی بنیاد رکھی۔ ۲۳ جولائی کو اس مجلس کا پہلا اجلاس ہوا]۔

ارزروم کی آبادی کے متعلّق جو مختلف اندازے کیے گئے ہیں اگر انھیں صحیح سمجھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ صدی کے دوران میں اس آبادی میں خاصی کمی واقع ہو گئی ہے، اگرچہ کسی ریلوے یا دوسری قسم کی سڑکوں کا کوئی اچھا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ارزروم کی اہمیّت کم ہو جاتی ہے؛ تاہم یہ شہر، جس کی آبادی Cuinet کے بیان کے مطابق اڑتیس ہزار نو سو چھے ہے [۱۹۴۵ء کی مردم شماری

کی رُو سے باشندوں کی تعداد ۵۲۵۳۴ ہے، جن میں سے تقریباً ۹۹ فی صد مسلمان ہیں]، مصالح جنگی کے اعتبار سے اہم ہے، کیونکہ یہ ایک مستحکم سرحدی مقام ہے، جہاں جدید طریقے سے قلعہ بندی کی گئی ہے، اگرچہ اس کے قلعے زیادہ مضبوط نہیں ہیں، نیز کاروباری اعتبار سے بھی ایک ولایت اور اس کے عقبی علاقے کا تجارتی مرکز ہونے کے طور پر اُسے اہمیّت حاصل ہے (سالانہ برآمد تقریباً ایک لاکھ پونڈ مالیّت کا سامان) اور اسی طرح ایران سے تجارت کے لیے ایک مرکزی مقام ہونے کی وجہ سے بھی۔ [جمہوریۂ ترکی کے زیرِسایہ ارزروم میں نئی طرز کے مدارس، شفا خانے، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے صنعتی مرکز وغیرہ قائم ہو گئے ہیں اور یہ شہر اناطولیہ کا ایک اہم ثقافتی مرکز بنتا جا رہا ہے۔ یہاں کے اون، چمڑے، خود سازی اور ٹائل بنانے کے کارخانے بھی قابلِ ذکر ہیں].

مآخذ: (۱) St. Martin: *Mémoires sur l' Arménie*، ۱:۶۶۔۶۹؛ (۲) یاقوت، ۱:۲۰۶؛ (۳) ابوالفِداء (طبع Reinaud)، ص ۳۸۴ ببعد؛ (۴) ابن بَطُّوطہ، ۲:۲۹۴؛ (۵) الدِمَشْقی (طبع Mehren)، ص ۱۸۹ ببعد؛ (۶) حاجی خلیفہ: جہان نما (قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ)، ص ۴۲۲؛ (۷) اولیا افندی: *Travels* (مترجمۂ ہامر von Hammer)، ۲:۱۰۴ ببعد؛ (۸) لی سٹرینج (G. Le Strange): *Eastern Caliphate*، ص ۱۱۷ ببعد؛ (۹) رِٹّر (Ritter): *Erdkunde*، ۱۰:۷۵۷۔۷۶۸؛ (۱۰) Nolde: *Reise nach Innerarabien*، ص ۲۵۸ ببعد؛ (۱۱) *Diplomatic and Consular Reports*، شمارہ ۴۷۳۴ (۱۹۱۱ء)؛ (۱۲) Cuinet: *Turquie d'Asie*، ۱:۱۸۳ ببعد؛ [(۱۳) آآ، ت، بزیر مادّہ، جہاں مآخذ کی مفصّل فہرست بھی دی گئی ہے].

(R. HARTMANN (ہارٹمان

---

* **اَرْزَن:** (سریانی: اَرْزُوْن، ارمن ارْزْن: Arzn، اَلْزْن Alzn) مشرقی اناطولیہ کے کئی شہروں کا نام۔ ان میں سب سے زیادہ اہم رومی صوبۂ ارزینِی (Arzanene) کا، جسے ارمن میں الزنخ (Aldznikh) کہتے ہیں، سب سے بڑا شہر تھا، جو دریاے دجلہ کے ایک معاون اَرْزن صُو (جدید گَرْزَنْسُو) کے مشرقی کنارے پر تقریباً ۴۱ درجہ ۱۴ دقیقہ طول بلد مشرقی اور ۳۸ درجہ عرض بلد شمالی (گرینچ) میں واقع تھا۔ مسلم مصنّفین نے اس شہر کو مغربی جانب کے بڑے شہر میّافارقین سے متعلّق بتایا ہے.

اس نام کی اصلیّت کا یقینی طور پر کچھ علم نہیں، لیکن اس کی قدامت میں کوئی شُبہ نہیں ہے؛ بحث کے لیے دیکھیے Hübschmann: *Die altarmenischen Ortsnamen*، در *Indogermanische Forschungen*، ۱۶ (۱۹۰۴ء): ۲۴۸، ۳۱۱؛ اس شہر کی اسلام سے پہلے کی تاریخ کے لیے، جب یہ ایک اسقف کی جاے قیام تھا، دیکھیے مارکار (Marquart): *Ērānšahr*، ص ۲۵.

ارزن ۲۰ھ/۶۴۰ء میں عِیاض بن غَنْم کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس علاقے کو پہلے الجزیرہ کے علاقے میں (البلاذری، ص ۱۷۶) اور پھر دیارِ بکر میں شامل کر دیا گیا۔ یہ شہر ایک نہایت زرخیز زرعی ضلع میں واقع تھا اور بقولِ قُدامہ (BGA، ۶:۲۴۶) بنو عبّاس کے زمانے میں ارزن اور میّافارقین کے اوسط مجموعی مداخل اکتالیس لاکھ درہم سالانہ تھے۔ حَمْدانیوں کے عروج تک ارزن پر ارمن امرا حکمران رہے، جو عربوں کے ساتھ ماتحت نیز عقدِ اطاعت و وفاداری کی بنا پر وابستہ تھے؛ قبّ Canard، ص ۴۷۲).

چوتھی/دسویں صدی کے آغاز میں جب سیف الدولہ حَمْدانی ارمنوں یا بوزنطی سلطنت کے خلاف فوج کشی کی تیاری کر رہا تھا تو اس نے ارزن میں سکونت اختیار کر لی۔ ۳۳۰ھ/۹۴۲ء میں بوزنطیوں نے ارزن کو فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا (Canard، ص ۴۸۷)۔ حمدانیوں نے شہرِ مذکور کو واپس لے لیا، لیکن انھیں دیار بکر کے علاقے میں بوزنطیوں کے خلاف کئی دفعہ لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ اس کے بعد اس شہر کی اہمیّت جاتی رہی اور بارھویں صدی عیسوی میں یاقوت (طبع وسٹنفلٹ (Wüstenfeld)، ۱:۲۰۵) نے لکھا کہ یہ شہر کھنڈروں کا ایک ڈھیر ہے.

بہت ہی کم سیّاح اس کے محلِّ وقوع کو دیکھ سکے ہیں، لیکن ٹیلر (J. G. Taylor) نے *JRGS*، ۳۵ (۱۸۶۵ء): ۲۶، میں اسے شناخت کیا ہے اور اس کے کھنڈروں کا ایک نقشہ بھی دیا ہے.

اس اَرْزن کو پاس ہی کے ایک چھوٹے سے موضع اَرْزن الرَّزم نامی کے ساتھ ملتبس نہیں کرنا چاہیے، جو اسی طرح ایک دریا بُہتان صُو (Bohtan su) کے کنارے پر واقع ہے، دیکھیے J. Markwart: *Südarmenien und die Tigrisquellen*، (وی آنا ۱۹۳۰ء)، ۱۴۱ و ۳۴۱؛ نیز اسے ارزن الروم (ارزروم) اور قریب کے بوزنطی شہر Αρτζε سے بھی ممیّز کرنا چاہیے.

مآخذ: متن میں جن حوالوں کا ذکر ہے ان کے علاوہ (۱) قبّ Marquart: *Die Entstehung und Wiederherstellung der armenischen Nation*، پوٹسڈم ۱۹۱۹ء، ص ۳۳۳؛ (۲) M. Canard: *Histoire de la Dynastie des Hamdanides*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۸۴؛ جہاں صفحے کے آخر میں حاشیہ ۱۷ میں ارزن سے متعلق عرب جغرافیہ نویسوں کے حوالہ جات دے دیے گئے ہیں؛ ص ۲۴۰ پر جو نقشہ درج ہے وہ بالخصوص دلچسپ ہے.

(R. N. FRYE (فرائی

---

* **اِرْزِنْجان:** (Erzindjān) ولایتِ اِرزروم میں ایک سنجق کا صدر مقام، جس کے باشندوں کی تعداد تیئیس ہزار ہے۔ اِرزروم اور سیواس کے درمیان قرہ صُو کے شمالی کنارے پر ایک زرخیز میدان میں واقع ہے۔ ارمن مآخذ کی رُو سے یہ شہر زمانۂ قبل مسیح سے چلا آتا ہے۔ اس شہر کے کچھ حالات ہمیں پہلی مرتبہ واضح طور پر سلجوقی عہد میں ملتے ہیں [دیکھیے مادۂ منگوچک (Mangučak)]۔

بقولِ یاقوت اس کے باشندے زیادہ تر ارمن تھے۔ ۶۲۷ھ/ ۱۲۳۰ء میں خوارزم شاہ جلال الدین [رکّ بآن] کو یہاں سلجوقی علاء الدین کیقباد اوّل اور ایوّبی الاشرف نے شکست دی۔ المُستَوفی (لی سٹرینج Le Strange: کتابِ مذکور) کا بیان ہے کہ ارزنجان کی فصیلوں کو کیقباد نے ازسرِ نو تعمیر کیا۔ ۶۴۰ھ/ ۱۲۴۳ء میں سلجوقیوں کی قوت مغلوں کے سامنے سرنگوں ہوگئی جو ارزروم کے راستے ایشیاے کوچک میں داخل ہوگئے۔ ابن بطوطہ کے وقت میں بیشتر آبادی ارمن تھی، لیکن اسے یہاں کچھ ترکی بولنے والے مسلمان بھی ملے تھے۔ اس شہر نے، جو ہمیشہ ترکمانوں کا ایک حصنِ حصین رہا، تھوڑے عرصے کے لیے بایزید اوّل کے عہد میں ترکی سیادت کو قبول کر لیا تھا۔ تیمور کے زمانے میں وہ قرہ قویونلو خاندان کے قرہ یوسف کے قبضے میں تھا اور پھر آق قویونلو کے اوزُون حسن کے ہاتھ میں چلا گیا۔ یہ زمانہ، جو غالبًا اس کی سب سے زیادہ خوش حالی کا دَور تھا، ترجان میں سلطان محمد ثانی کی اوزُون حسن پر فتح کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ترکی حکومت کے ماتحت یہ شہر موجودہ زمانے تک ارزروم کی ولایت (پاشالک) کا ایک جز رہا ہے۔ کئی بار زلزلے سے تباہ ہونے کے باوجود (خاص طور پر ۱۷۸۴ء میں) اپنے گردوپیش کے علاقے کی زرخیزی کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ دوبارہ اپنی حالت درست کرنے کے قابل ہو گیا۔ [جنوری ۱۹۳۹ء میں اس شہر کو ایک اَور خوف ناک زلزلے کا سامنا کرنا پڑا، جس سے وہ تقریبًا تباہ ہوگیا اور کئی قدیم اور مشہور عمارتیں، مثلًا اولو جامع (بنا کردۂ سلجوقی سُلطان کِلابی بے)، کُرشونلو جامع اور تاش خان (عہد سلطان سلیمان اوّل سے منسوب)، بے حمّامی، چادر جی جامعی، خلیل اللہ جامعی وغیرہ مسمار ہوگئیں۔ قدیم ارزنجان ایک سرسبز میدان کے وسط میں دریاے قرہ صُو کے مجرٰی کے شمال میں آباد تھا۔ اس تباہی کے بعد اس کی جگہ ایک نیا عارضی شہر ریلوے سٹیشن کے شمال میں بن گیا ہے، جہاں فقط ایک منزل کے اور زیادہ تر لکڑی کے مکان ہیں۔ کچھ دکانیں اور مکتب وغیرہ بھی بن گئے ہیں اور شہر کو ازسرِ نو ٹھیک سے تعمیر کرنے کا کام جاری ہے۔ ۱۹۴۵ء کی مردم شماری میں ارزنجان کی آبادی ۱۲,۶۳۰ نفوس پر مشتمل تھی۔] یہاں سے زیادہ تر پھل اور ترکاریاں باہر بھیجی جاتی ہیں۔ ایک فوجی چوکی کے طور پر اس کا شمار ترکی کی مشرقی سرحدوں کے بڑے دفاعی مورچوں میں ہے.

مآخذ: (۱) St. Martin: *Mémoires sur l' Arménie*، ۱:۷۱ ببعد؛ (۲) یاقوت، ۱:۲۰۵؛ (۳) ابوالفداء (طبع Reinaud)، ص ۳۹۲ ببعد؛ (۴) ابن بطوطہ، ۲: ۲۹۳؛ (۵) الدمشقی، ص ۲۲۸؛ (۶) حاجی خلیفہ: جہان نما (قسطنطینیہ ۱۱۴۵ھ)، ص ۴۲۴؛ (۷) اولیاء افندی: *Travels* (مترجمۂ von Hammer)، ۲:۲۰۲ ببعد؛ (۸) لی سٹرینج (G. Le Strange): *Eastern Caliphate*، ص ۱۱۸؛ (۹) رِتَّر (Ritter): *Erdkunde*، ۱۰: ۷۷۰ - ۷۷۴؛ (۱۰) Cuinet: *Turquie d'Asie*، ۱:۲۱۱؛ [(۱۱) آ ت، بزیرِ مادہ، جہاں بعض نئے مآخذ بھی مذکور ہیں].

(R. Hartmann)

---

* **اِرْزَن الرُّوم:** رکّ بہ اِرزروم.

---

* **اَرَس:** رکّ بہ الرَّس.

---

* **اَرِسطُو طالِیس یا اَرِسطُو:** یعنی Aristotle، چوتھی صدی قبل مسیح کا یونانی فلسفی، جس کی تصنیفات کا مطالعہ یونانی فلسفے کے دبستانوں میں پہلی صدی قبل مسیح سے مستقل طور پر مروّج ہوگیا.

(۱) اس کے شارحین، یعنی دمشق کا نکولاس (Nicolaus؛ پہلی صدی ق-م)، اَفرودیسیاس (Aphrodisias) کا الگزانڈر (Alexander؛ م ۲۰۰ء)، تھیمِسْطِیس (Themistius) (چوتھی صدی ق-م)، جان فِلو پُونُس (John Philoponus) اور سِمپْلِیسیس (Simplicius) (چھٹی صدی ق-م) [کی تحریروں] سے پتا چلتا ہے کہ اتنی متأخر یونانی تعلیم میں ارسطو کو کس طریق سے سمجھا جاتا تھا۔ بہ استثناے معدودے چند (قبّ نیچے) اَرِسطو کی اکثر تصنیفات آخر کار عربوں کو تراجم کے ذریعے معلوم ہوگئیں اور ارسطو کے عرب معلّمین اور مسلمان مصنّفینِ فلسفہ بہت سی شرحوں کا بھی (جن میں سے بعض سے ہم اصل یونانی زبان میں واقف ہیں اور بعض صرف عربی ترجموں میں محفوظ ہیں، بلکہ عربی سے کیے ہوے عبرانی ترجموں میں بھی) پوری طرح مطالعہ کر چکے تھے۔ ارسطو کے مطالعے کی مشرقی روایت بلا انقطاع اس کے متأخر یونانی شارحین کا تتبّع کرتی رہی؛ چنانچہ قرونِ وسطٰی کی مغربی روایت اسی حد تک ارسطو کے اسلامی مطالعے پر اعتماد کرتی ہے جس حد تک کہ اس کے فکر کی یونانی اور بوزنطی شرحوں پر (بالخصوص اُن ابواب میں جو الفارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی وساطت سے معلّمینِ فلسفہ تک پہنچے ہیں)۔ بیشتر عرب فلسفی ارسطو کو بلا تأمّل فلسفے کا ممتاز ترین اور بے مثل نمائندہ مانتے ہیں، یعنی الکِندی سے لے کر (قبّ ابورِیدہ: رسائل، ۱: ۱۰۳، ۱۱۷) ابن رشد تک، جس نے اس کی بے لاگ مدح ان الفاظ میں کی ہے (*Comm. Magnum in Arist. De anima*، *III*، ۲: ۴۳۳ طبع Crawford): ارسطو ''وہ مثالی شخصیّت ہے جسے قدرت نے انسانیت کے منتہاے کمال کے اظہار کے لیے خلق کیا تھا'' (Exemplar quod natura invenitad demonstrandum ultimam perfectionem humanam)۔ چنانچہ ارسطو کا ذکر اکثر ''الفیلسوف'' [''الحکیم''] کے نام سے کیا جاتا ہے اور الفارابی کا لقب ''المعلّم الثّانی''، ضمنًا ارسطو کے ''المعلّم الاوّل'' ہونے کا اعتراف ہے.

چونکہ مسلم ارسطوئیت کا مکمل جائزہ لینے کے معنی عملًا یہ ہوں گے کہ مسلمانوں کے پورے فلسفیانہ فکر کی مکمل تاریخ لکھی جائے اس لیے یہاں اسی پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ خاص خاص حقائق بیان کر دیے جائیں اور مطالعے کے اُن وسائل کا نام دے دیا جائے جو اس وقت موجود ہیں۔ عرب یونانی شارحین سے اس باب میں متفق ہیں کہ ارسطو ایک اذعانی (dogmatic) فلسفی اور ایک مختتم نظامِ فلسفہ کا بانی ہے۔ اس کے علاوہ اسے (پھر اُسی طریقے سے کہ جس سے یونانی نو افلاطونی

معلّم ناواقف نہ تھے) اپنے فکر کے تمام بنیادی عقائد میں افلاطون سے متفق یا کم از کم اس کی تکمیل کرنے والا فرض کیا جاتا ہے۔ عرب تو اس حد تک پہنچ گئے کہ انھوں نے مابعد الطبیعیات کے نو افلاطونی خیالات و تصوّرات کو بھی ارسطو سے منسوب کر دیا اور اس لیے یہ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ فلوطینوس (Plotinus) [کے فلسفے] کے ایک گم شدہ یونانی ترجمے کے بعض اجزا اور پروکلوس (Proclus) کی *Elements of Theology* کے بعض ابواب کا ازسرِ نو مرتب کردہ نسخہ علی الترتیب ارسطو کی الٰہیات (*Theology*) اور ارسطو کی کتاب خیر محض (*Book of Pure Good* یا *Liber De Causis*) تصوّر ہونے لگے۔

انجام کار عرب ارسطو کے تقریباً تمام اہم ترسلسلۂ درسیات سے، بہ استثناے *Politics* (سیاسیات)، *The Eudemian Eethics* (اخلاقیات)، اور *Magna Moralia* (اخلاق فاضلہ)، واقف ہو گئے۔ ان کے پاس اس کی *Dialogues* (مکالمات) کا کوئی ترجمہ نہ تھا، کیونکہ مابعد یونانیت کے زمانے میں اس کی مقبولیت گھٹ گئی تھی۔ اس طرح عربوں کا علم ارسطو کے اُن چند منطقی رسائل سے بہت آگے نکل گیا تھا جو لاطینی قرونِ وسطٰی کی ابتدا میں Boethius کے ترجمے کے ذریعے یورپ میں معروف ہوے اور اس کے احاطے میں تمام متأخّر یونانی درسیات آجاتی تھیں (نیز قب ایک معنی خیز عبارت در *Comm. in Arist. Craeca*، ۳/۱: ۱۷ ببعد)۔ معروف رسائل اور ان کی قدیم شرحوں کے جائزے ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۴۸ - ۲۵۲، طبع Flügel (طبع مصر، ص ۳۴۷ - ۳۵۲) اور ابن القفطی: تأریخ الحکماء، ص ۳۴ - ۴۲، طبع Lippert، میں موجود ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ابن القفطی کی کتاب مذکور، ص ۴۲ - ۴۸ (قب ابن ابی اُصَیبِعہ: عیون الانباء فی طبقات الاطبّاء، ۱: ۶۷ ببعد) میں ارسطو کی تصنیفات کی وہ اصلی یونانی فہرست محفوظ ہے جسے مفقود مان لیا گیا تھا اور جو کسی بطلیموس (Ptolemy) کی طرف منسوب ہے، قب A. Baumstark: *Syrisch-Arabische Biographien des Aristoteles*، لائپزگ ۱۹۰۰ء، ص ۶۱ ببعد اور P. Moraux: *Les listes anciennes des ouvrages d' Aristotle*، لووین (Louvain) ۱۹۵۱ء، ص ۲۸۹ ببعد۔

ارسطو کے سارے درسی نصابوں سے عرب ایک دم نہیں بلکہ بہ تدریج واقف ہوے۔ پہلے مترجمہ متون، جن کا ہمیں علم ہے، اُس نصاب درسیات کی طرح جو شام کے رہبانی مدارس میں جاری تھا اور جس کا یونانی مصنّفین کے آباے کلیسا (Patristics) تتبع کرتے تھے اصطلاحی منطق تک محدود تھے، یعنی فرفوریوس (Porphyry) کی ایسا غوجی (*Isagoge*)، مقولات (*Categories*)، مدلولات (*De Interpretatione*) اور مبادی علم البیان (*Prior Analytics*) کا کچھ حصّہ۔ ارسطو کا پہلا مترجم، جس کی تصنیف کا ہمیں علم ہے (گو ابھی تک وہ طبع نہیں ہوئی)، محمد بن عبداللہ ہے، جو مشہور ابن المقفع کا بیٹا تھا (قب P. Kraus: در *RSO*، ۱۹۳۳ء)۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان پر *Topics*، *Rhetoric*، *Posterior Analytics*، اور *Poetic* کا اضافہ ہوا (جو متأخّر یونانی روایت کے مطابق منطقی تصنیفات میں شامل تھیں)، لیکن المأمون کے عہد میں بیت الحکمت کی تاسیس سے پہلے ارسطو کی غیر منطقی تصنیفات تک [عربوں کی] دسترس نہ ہوئی تھی۔ ابتدائی تراجم کی بابت تاریخی تفصیلات ابھی تک کمیاب ہیں؛ تاہم کتب متعلقۂ فلکیات (*On the Heaven*)، کائنات الجوّ (*Meteorology*)، علم الحیوانات کی بڑی کتابیں، مابعد الطبیعیات (*Metaphysics*) کا بیشتر حصّہ، *the Sophistici Elenchi* اور (بہ گمانِ غالب) *Prior Analytics* کے قدیم عربی تراجم آج تک بھی باقی ہیں، اور نام نہاد الٰہیات ارسطو *Theology of Aristotle* (قب اوپر) کا ترجمہ بھی اسی ابتدائی دور میں ہوا۔ الکندی نے ارسطو [کے فلسفے] کو جس حد تک بھی سمجھا ہے وہ انھیں قدیم تراجم پر مبنی ہے (قب M. Guidi و R. Walzer: *Studi su al-Kindi I, Uno scritto introduttivo allo studio di Aristotele*، روم ۱۹۴۰ء)۔ حُنَین بن اسحٰق اور اس کے بیٹے اسحٰق، نیز فلسفۂ طب اور عام طور پر یونانی علوم کے اس شہرۂ آفاق مرکز تراجم کے دیگر رفقا نے ارسطو کی تصنیفات کے بعض سابقہ ترجموں کی اصلاح کی اور بعض کا خود پہلی بار ترجمہ کیا۔ ان جملہ تراجم کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ مترجم کبھی تو اصلی یونانی متون سے ترجمہ کرتے تھے اور کبھی قدیم تر یا اُسی زمانے کے سریانی ترجموں کے واسطے سے۔ ان میں زیادہ اچھے مترجم اپنا کام شروع کرنے سے پہلے کوشش کرتے تھے کہ اصل یونانی متن متعین ہو جائے۔ غرض رفتہ رفتہ دسویں صدی میں بغداد میں ارسطو کے مطالعے کی ایک مستحکم روایت قائم ہو گئی، جسے ابو بِشر مَتّٰی، یحیٰی بن عَدِی اور دوسرے عیسائی عرب فلسفیوں نے برقرار رکھا، جو اپنے آپ کو، غالبًا بجا طور پر، اسکندریہ کے دبستانِ فلسفہ کے متأخّر وارث تصوّر کرتے تھے۔ وہ نصابِ تعلیم، جس کی وہ پیروی کرتے تھے کچھ تو سابقہ اور کچھ خود ان کے اپنے کیے ہوے ترجموں پر مبنی تھا (جو انھوں نے قدیم تر یا جدید سریانی ترجموں سے کیے تھے)، کیونکہ اس دبستان کے نمائندوں میں سے زیادہ تر اب یونانی زبان نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ارسطو کے خیالات سے الفارابی کی واقفیت کو بھی اس حلقے کی کارگزاریوں کا مرہونِ منّت سمجھنا چاہیے (الفارابی کا رسالہ *On Aristotle's Philosophy* محسن مہدی چھپوا کر شائع کرنے والے ہیں) اور بعد کے تمام مسلمان فلاسفہ بھی اسی طرح اپنی معلومات اسی مجموعۂ تراجم پر مبنی کرتے ہیں جو (تقریبًا دو سو سال کی لگا تار محنت کے بعد) آخر کار بغداد میں مرتب ہوا اور وہاں سے جملہ اسلامی ممالک میں ایران سے لے کر اندلس تک پھیل گیا۔ ان مترجمین کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحت اور یونانی نسخوں کے اختلافِ قراءت سے واقفیت میں یہ مترجم ابن رشد سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ اصل یونانی متن کی تعیین کے لیے ان عربی ترجموں کی اہمیت یقینًا کم نہیں ہے اور وہ ایسی ہی توجہ کے مستحق ہیں جیسی کہ یونانی اوراق بردی (papyrus) یا کوئی قدیم یونانی مخطوطہ یا وہ اختلافاتِ قراءت

جوخود یونانی شارحین نے قلم بند کیے ہیں۔اس کے علاوہ ہمیں ان سے عام طور پر متون کی تاریخ کا ایک زیادہ قرینِ عقل تصوّر قائم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

عرب ارسطو کے اصلی متن کے ساتھ ساتھ ہی یونانی شارحین سے واقف ہو گئے تھے اور ان کا اثر ہمیں مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے، مثلاً پورے پورے متون جو ارسطو کے اساسی مقدمات کے قضایا (lemmata) پر مشتمل تھے، Themistius اور اس جیسے لوگوں کے مجمل ترجمے، علٰیحدہ علٰیحدہ رسائل کے طریق استدلال کے زیادہ مختصر جائزے اور مخطوطات کے حواشی، جن میں بعض جملے اور نظریات ضخیم تر کتابوں سے لے کر نقل کر دیے گئے ہیں۔ان یونانی شرحوں کے تراجم میں سے کچھ زیادہ نہیں بچے، کیونکہ جو عرب فلسفۂ ارسطو کے متأخّر یونانی ماہرین کے جانشین ہوے انھوں نے خود اپنے نام سے شرحیں اور خصوصی رسائل (monographs) لکھے ہیں۔پھر ان میں سے بھی اپنی اصلی شکل میں ہم تک کم ہی پہنچے ہیں؛[مثلاً] ارسطو کے رسائل پر الفارابی کی شرحوں میں سے اس وقت تک ایک کا بھی سراغ کسی کتب خانے میں نہیں ملا۔ابن باجّہ نے رسائل ارسطو کے جو مفصّل خلاصے لکھے ہیں اس وقت تک ان کی تصحیح اور طباعت نہیں ہوئی۔ابن رشد کی چند مختصر اور زیادہ مطوّل شرحوں کا بھی علم ہے، بحالیکہ بعض اور محض عبرانی اور لاطینی ترجموں کی شکل میں محفوظ رہیں۔

ارسطو کی ان کتابوں کی (بشمول بعض اہم جعلی تصانیف)، جو اس وقت مطالعے کے لیے مل سکتی ہیں، فہرست حسبِ ذیل ہے:

(الف)

(۱) *Categories* (مقولات): الحسن بن سُوار کا اسحٰق بن حنین کے ترجمے کا ایڈیشن خلیل جیور (Georr) نے اُن تمام حواشی کے ساتھ، جو مکتبۂ اہلیہ پیرس کے نسخے، عدد Ar.۲۳۴۶، میں موجود ہیں، مع ان حواشی کے فرانسیسی ترجمے اور اشاریۂ اصطلاحات کے، بعنوان *Les Catégories d' Aristote dans leurs versions Syro-Arabes*، شائع کیا تھا، بیروت ۱۹۴۸ء (قب *Oriens*، ۶، ۱۹۵۳ء: ص ۱۰۱ ببعد)؛ دوسری طباعت (حواشی کے بغیر) از احمد-بدوی: منطق ارسطو، ص ۱-۵۵، ۳۰۷ ببعد و ۶۷۳ ببعد۔ابن رشد کی الشرح الاوسط (مع مقدّمات کے تنقیدی متن کے M. Bouyges کی طبع، بعنوان *Bibliotheca Arabica Scholasticorum*، ج ۴، بیروت ۱۹۳۲ء، میں موجود ہے۔

(۲) *De interpretatione*: اسحٰق بن حنین کے ترجمے کا بہترین ایڈیشن، از Pollack، لائپزگ ۱۹۱۳ء؛ ایک اَور طباعت از احمد بدوی: کتاب مذکور، ص ۵۷-۹۹۔

(۳) *Prior Analytics* تھیوڈورس Theodorus (ابوقُرّہ؟) کے ترجمے کا ایڈیشن الحسن بن سُوار نے مع طویل حواشی کے پہلی بار نشر کیا؛ کتاب مذکور، ص ۱۰۳-۳۰۶ (قب *Oriens*، ج ۶، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۸-۱۲۸)۔

(۴) *Posterior Analytics*: ابوبِشر مَتّی کے ترجمے کا پہلا ایڈیشن (جو حنین بن اسحٰق کے سریانی ترجمے پر مبنی ہے) اور متأخّر علما کے حواشی شائع کردہ احمد بدوی: کتاب مذکور، ص ۳۰۹-۴۶۲ (قب *Oriens*، ۶، ۱۹۵۳ء: ص ۱۲۹ ببعد)۔

(۵) *Topics*: ابوعثمان الدمشقی اور عبداللہ بن ابراہیم اور متأخّر علما کے ترجموں کے پہلے ایڈیشن مع حواشی، شائع کردہ احمد بدوی: کتاب مذکور، ص ۴۶۷-۷۳۳۔

(۶) *Sophistici Elenchi*: تین ترجموں (یحیٰی بن عَدِی وعیسٰی بن زُرْعَہ اور ابن ناعِمَہ) کی طبع اوّل، از احمد بدوی: کتابِ مذکور، ص ۷۳۶-۱۰۱۸؛ قب C. Haddad: *Trois versions inédites des Refutations Sophistiques*، مقالہ (Thesis)، پیرس ۱۹۵۲ء۔

(۷) *Rhetoric*: مخطوطۂ پیرس، عدد Ar.۲۳۴۶، کا کوئی ایڈیشن موجود نہیں ہے، قب D. S. Margoliouth: *Semitic Studies in memory of A. Kohut* (برلن ۱۸۹۷ء) ص ۳۷۶ ببعد؛ S. M. Stern: *Ibn al-Samḥ*، در *JRAS*، ۱۹۵۶ء، ص ۴۱ ببعد؛ F. Lasinio: *Il comm-ento medio di Averroë alla Retorica di Aristotele*، (فلورنس ۱۸۷۷ء—کتاب اوّل کے ایک حِصّے کا ایڈیشن)؛ A. M. A. Sallam: *Averroes' commentary on the third book of Aristotle's Rhetoric*، مقالہ (اوکسفرڈ ۱۹۵۲ء)، ٹائپ شدہ نسخہ۔

(۸) *Poetics*: ابوبِشر کے ترجمے کی طباعتیں: از (۱) مرجلیوث (D. S. Margoliouth ۱۸۸۷ء، لاطینی ترجمہ ۱۹۱۱ء)؛ (۲) از J. Tkatsch (بعنوان *Die arabische Übersetzung der Poetik und die Grundlage der Kritik des griechischen Textes*، ۲ جلد، وی انا ۱۹۲۸-۱۹۳۲ء)؛ (۳) از احمد بَدَوِی (ارسطوطالیس، فنّ الشعر، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۸۵-۱۴۳)۔ *Poetics* کے متون، از (۱) الفارابی (فی قوانین صِناعۃ الشعراء، طبع آربری (Arberry)، در *RSO*، ۱۶، ۱۹۳۸ء)؛ (۲) ابن سینا (ماخوذ از شِفاء، طبع مرجلیوث (Margoliouth) اور (۳) ابن رشد (الشرح الاوسط، طبع Lasinio) بھی اسی کتاب میں دوبارہ چھاپے گئے ہیں۔

(۹) *Physics*: اسحٰق بن حُنَین کے ترجمے کے مخطوطۂ لائڈن (عدد ۱۴۴۳) کے بارے میں قب S. M. Stern: *Ibn al Samḥ*، در *JRAS*، ۱۹۵۶ء، ص ۳۱ ببعد۔اس کا تنقیدی ایڈیشن *Bibliotheca Arabica Scholas-ticorum* میں شائع کیا جائے گا۔ابن رشد کی الشرح الاوسط حیدر آباد کے ۱۹۴۷ء کے ایک ایڈیشن میں موجود ہے، [دیکھیے] رسائل ابن رشد، کراسہ ۱۔

(۱۰) De caelo: موزۂ برطانیہ کا مخطوطہ، عدد Add ۷۴۵۳ (یحیٰی بن البِطْرِیق کا ترجمہ)۔ایک تنقیدی ایڈیشن *Bibliotheca Arabica Scholasticorum* میں شائع کیا جائے گا۔ Themistius کی شرح (جو

اس کے سوا ناپید ہے) کا عبرانی متن (مع ترجمۂ لاطینی S. Landauer نے بعنوان *Commentaria in Aristotelem Graeca* طبع کیا تھا، ۴ V، برلن ۱۹۰۲ء؛ ابن رُشد کی الشرح الاوسط، رسائل [ابن رُشد] (قب اوپر)، کراسہ ۲، میں موجود ہے۔

(۱۱) *De. gen. et. corr.*: قب رسائل ابن رشد، کُرّاسہ ۳۔ الاسکندر اَفْرُودیسی (Alexander of Aphrodisias) کی مفقود شرح کے ایک شذرے کے لیے قب مخطوطۂ Chester-Beatty، عدد ۳۷۰۲، ورق ۱۶۸ ب۔

(۱۲) *Meteorology*: یحییٰ بن البطریق کا ترجمہ، در مخطوطۂ پنی جامع، عدد ۱۱۷۹ و Vat. Hebr.، عدد ۳۷۸؛ [دیکھیے] رسائل ابن رشد، کُرّاسہ ۴۔

(۱۳) *De naturis animalium* (= *On the parts of animals, on the generation of Animals, History of Animals*): ترجمہ از یحییٰ بن البطریق، در مخطوطۂ موزۂ برطانیہ Add ۷۵۱۱ و مخطوطۂ لائڈن، عدد ۱۶۶۔ Gol. G. Furlani، در *RSO*، ۹، ۱۹۲۲ء، ص ۲۳۷۔

(۱۴) *De plantis* (از نکولس Nicolaus دمشقی): اسحٰق بن حُنَین کا ترجمہ، تصحیح کردۂ ثابت بن قُرّہ، جسے A. J. Arberry نے (مخطوطۂ پنی جامع، عدد ۱۱۷۹، سے لے کر) طبع کیا، قاہرہ ۱۹۳۳۔۱۹۳۴ء اور پھر دوبارہ احمد بَدَوی نے *Islamica*، ۱۶، قاہرہ ۱۹۵۴ء: ص ۲۴۳ ببعد میں؛ قب H. J. Drossaart Lulofs: *Journal of Hellenic Studies*، ۷۷، ۱۹۵۷ء: ص ۷۵ ببعد۔

(۱۵) *De anima*: اسحٰق بن حُنَین کے عربی ترجمے کا پہلا ایڈیشن، از احمد بدوی، در *Islamica*، ۱۶، قاہرہ ۱۹۵۴ء: ص ۱۔۸۸ (متن ماخوذ از مخطوطۂ آیا صوفیا، عدد ۴۵۰۵)۔ کسی گمنام مصنّف کا ترجمہ احمد فواد الاَہْوَانی نے طبع کیا، قاہرہ ۱۹۵۰ء (قب *Oriens*، ۶، ۱۹۵۳ء: ص ۱۲۶ ببعد، اور *JRAS*، ۱۹۵۶ء، ص ۵۷ ببعد)۔ Themistius کے مبدّل متن کے بعض حِصّوں کا عربی ترجمہ (شرح در Arist. Graeca، ۵ V، قب M. C. Lyons، در *BSOAS*، ۱۷، ۱۹۵۵ء: ص ۴۲۶ ببعد؛ *Ibn Badjdja, Paraphrase of Aristotle's De anima*، طبع و ترجمۂ انگریزی، از ایم۔ ایس۔ حسن، مقالۂ اوکسفرڈ ۱۹۵۲ء (ٹائپ کردہ نسخہ)؛ رسائل ابن رشد، کراسہ ۵ (طبع دیگر قاہرہ ۱۹۵۰ء)؛ *Averrois Commentarium Magnum in Aristotelis De anima Libros*، مرتبہ از سرنو از F. S. Crawford، کیمبرج میسا چیوسٹس ۱۹۵۳ء (لاطینی ترجمے کی تنقیدی طباعت)؛ قب نیز ابن سینا: کتاب الاِنْصاف، ص ۷۵۔۱۱۶ طبع بَدَوِی: ارسطو عندالعرب، قاہرہ، ۱۹۴۷ء)۔

(۱۶) *De sensu et sensato. De longitudine et brevitate vitae*: ابن رشد کے ترجمے احمد بدوی نے طبع کیے، در *Islamica*، ۱۶، قاہرہ ۱۹۵۴ء: ص ۱۹۱ ببعد۔ *Averrois Compendia Librorum qui Parva Naturalia vocantur*، مرتبہ از سرنو از A. L. Shields، کیمبرج (میسا چیوسٹس) ۱۹۴۹ء (لاطینی ترجمہ)۔

(۱۷) *Metaphysica*: کتاب A5، a، ۹۸۷ الف، ۵ ببعد، B-1 و A کے عربی متن کی طبع اوّل (از مخطوطات لائڈن عدد or. ۲۰۷۴ و ۲۰۷۵) از M. Bouyges، در *Bibliotheca Arabica Scholasticorum*، ج ۵۔۷، بیروت ۱۹۳۸۔۱۹۵۲ء (مع ابن رشد کی الشرح الکبیر کے)۔ کتاب A کی شرح از Themistius کے عربی ترجمے کا ایک حِصّہ بَدَوِی نے شائع کیا، در ارسطو عندالعرب، قاہرہ ۱۹۴۷ء، ص ۳۲۹ ببعد، ۱۲ ببعد [کذا، ؟]۔ پورا متن عبرانی اور لاطینی میں S. Landauer نے شائع کیا، در *Comm. in Aristotelem Graeca*، ۴ V، برلن ۱۹۰۳ء (اصل یونانی متن گم ہو چکا ہے)۔ الاسکندر افرودیسی کے لیے قب J. Freudenthal: *Die durch Averroes erhaltenen Fragmente Alexanders zur Metaphysik des Aristoteles*، برلن ۱۸۸۵ء؛ قب نیز بدوی: ارسطو عندالعرب، ص ۳۔۱۱ و ابن سینا: کتاب الانصاف، ص ۲۲۔۳۳ (طبع بدوی: ارسطو عندالعرب)۔

(۱۸) *Nicomachean Ethics*: آخری چار کتابوں کا سراغ مراکش میں مل گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کتاب کے ایک حصّے کے ایک اَور ترجمے کا، جو نکولس دمشقی کی طرف منسوب ہے، قب A. J. Arberry، در *BSOAS*، ۱۹۵۵ء، ص ۱ ببعد۔ *Summaria Alexandrinorum* کی کتب ۱، ۷ اور ۸ مخطوطۂ تیمور پاشا، اخلاق، عدد ۲۹۰، میں موجود ہیں۔

(۱۹) *De Mundo*: سریانی ترجمہ (از عیسٰی بن ابراہیم النَّفِیسی)، در مخطوطۂ Princetonianus RELS، ۳۰۸، اوراق ۲۹۳ ب تا ۳۰۳ ب؛ قب W. L. Lorimer: *American Journal of Philology*، ۵۳، ۱۹۳۲ء: ص ۱۵۷ ببعد۔

(ب)

گم شدہ تصانیف کے اجزا

(۱) *Eudemus* (؟): R. Walzer: *Studi Italiani di Filologia Classica*، سلسلۂ جدید، ج ۱۴، ۱۹۳۷ء: ص ۱۲۵ ببعد؛ Sir David Ross: *The Works of Aristotle translated into English*، اوکسفرڈ ۱۹۵۲ء، ۱۲: ۲۳ (قب الکِندی: رسائل، ۱: ۱۷۹، ۲۸۱)۔

(۲) *Eroticus* (؟): R. Walzer، در *JRAS*، ۱۹۳۹ء، ص ۴۰۷ ببعد؛ Sir David Ross، در مجلۂ مذکور، ص ۲۶۔

(۳) *Protrepticus* (؟): S. Pines: *Archives d' Histoire doctrinale et litteraire du Moyen Age*، ۱۹۵۷ء (ماخوذ از مِسْکویہ: تہذیب الاخلاق، باب ۳)۔

(۴) *De philosophia* (؟): S. van den Bergh: *Ave-*

rroes' Tahāfut al-Tahāfut[ابن رشد کی تہافت التہافت]، لنڈن ۱۹۵۴ء، ۲:۹۰.

(ج)

وہ کتابیں جو عربی روایات میں ارسطو سے منسوب کی گئی ہیں

(۱) De pomo(کتاب التُفّاحۃ): J. Kraemer: Das arab-ische Original des' Liber de pomo' (کو/پرولو، عدد ۱۶۰۸)، در Studi Orientali in onore di G. Levi della vida، روم ۱۹۵۶ء، ۱: ۴۸۴ بعد؛ مرجلیوث (D. S. Margoliouth): The Book of the Apple, ascribed to Aristotle، طبع در فارسی و انگریزی، در JRAS، ۱۸۹۲ء، ص ۱۸۷ بعد.

(۲) J. Ruska: Das Steinbuch des Aristoteles، ہائیڈل برگ ۱۹۱۲ء.

(۳) Secretum Secretorum (سِرُّ الأَسْرار)، طبع احمد بدَوی، در Islamica، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ۱۵: ۶۷-۱۷۱.

(۴) Περὶ βασλείαζ، طبع J. Lippert، مقالہ، Halle ۱۸۹۱ء؛ قبّ گولٹ تسیہر (I. Goldziher)، در Der Islam، ۱۹۱۶ء، ۶: ۱۷۳ بعد.

(۵) Theology of Aristotle: جس کی بنیاد غالبًا فلوطینوس کے بعض حصّوں کی مبدّل یونانی شکل پر ہے، طبع F. Dieterici، لائپزگ ۱۸۸۲ء (جرمن ترجمہ، وہی کتاب، ۱۸۸۳ء)، طبع جدید از احمد بدوی، در Islamica، ج ۲۰، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔ ابن سینا کے حواشی بدوی نے شائع کیے ہیں، در ارسطو عندالعرب، ص ۳۷ بعد اور G. Vajda نے ان کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے، در Revue Thomiste، ۱۹۵۱ء، ص ۳۴۶ بعد؛ قبّ نیز S. Pines: Revue des Études Islamiques، ۱۹۵۴ء، ص ۷ بعد.

(۶) Liber de Causis: جس کی بنیاد Proclus کی Elements of Theology پر ہے، طبع O. Bardenhewer، Freiburg، ج ۱ Br. ۱۸۸۲ء (مع جرمن ترجمہ؛ طبعِ نو از احمد بدوی، در Islamica، ج ۱۹، قاہرہ ۱۹۵۵ء.

ارسطو کے اُن سوانح حیات سے جو عربی میں لکھے گئے ہیں ان معلومات میں تقریبًا کچھ بھی اضافہ نہیں ہوتا جو یونانی متون میں موجود ہیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں: ابن الندیم: الفہرست (قبّ بیانِ بالا)؛ مُبَشِّر بن فاتِک: مختار الحکَم (قبّ J. Lippert: Studien auf dem Gebiet der griechisch-arabischen Übersetzungs-literatur I، برلن ۱۸۹۴ء، ص ۴ بعد و F. Rosenthal، در Orientalia، ۶، ۱۹۳۷ء: ص ۲۱ بعد)؛ صاعد الاندلسی: طبقات الامم، ص ۲۴ بعد؛ ابن القفطی: تاریخ الحکماء، ص ۲۷ بعد (طبع Lippert)؛ ابن جُلجُل: طبقات الاطباء والحکماء (طبع فؤاد سیّد، ۱۹۵۵ء)، ص ۲۵ بعد؛ ابن ابی اُصَیبعہ: عُیون الانباء، ۱: ۵۴ بعد، طبع مُلّر۔ ان سوانح حیات کے بعض حصّوں کا ترجمہ اور مقابلہ A. Baum-stark نے کیا تھا، کتاب مذکور، ص ۳۹ بعد، ۱۱۷ بعد، ۱۲۸ بعد۔ عربی میں مترجمہ تمام تصانیف اور شرحوں کی اس نہایت جامع فہرست پر جو ابن الندیم اور ابن القفطی میں ملتی ہے مُلّر (A. Müller) نے Die griechischen Philosophen in der arabishen Überlieferung، Halle ۱۸۷۳ء، میں اور M. Steinschneider نے Die arabischen Überstzungen aus dem Griechischen, Beihefte zum Centralblatt für Bibliothekswesen، ج ۵، ۱۸۹۳ء، میں بحث کی ہے۔ گم شدہ یونانی فہرست، مرتبۂ بطلیموس، جس کی اب تک شناخت نہیں ہو سکی (قبّ اوپر)، A. Müller نے Morgenländische Forschungen Festschrift Fleischer، لائپزگ ۱۸۷۵ء، ص ۱ بعد، میں اور M. Steinschneider نے ارسطو طالیس کی طبع برلن، ج ۵، ۱۸۷۰ء: ص ۱۴۶۹ بعد، میں شائع کی، نیز Aristotle: Fragmenta، طبع روز V. Rose، ص ۱۸ بعد، میں A. Baumstark اور P. Moraux نے (دیکھیے اوپر)۔ ارسطو کے سوانح حیات سے متعلّق عربی کی تمام روایات پر ایک جدید اور سیر حاصل بحث I. Düring: Aristotle in the Ancient Biographical Tradition، Goteborg ۱۹۵۷ء میں ملے گی.

(R. WALZER)

اَرْش: رکّ بہ دِیۃ. *

----

* اَرْشُذُونَہ: (Archidona یا اُرجُذُونَہ)، جنوبی ہسپانیہ کا ایک پرانا شہر، جس کا قدیم نام یقینی طور پر معلوم نہیں۔ یہ شہر آج کل کے صوبۂ مالقہ (Malaga) کے شمال مشرقی کونے میں وادی الحور (Guadalhorje) کے منبع کے قریب انتقیرہ (Antequera) اور لوشہ (Loja) کے درمیان (دریاے شنیل (Genil) پر) واقع ہے؛ اس کی آبادی نو ہزار ہے۔ عربوں نے اس پر [۹۲ھ/]۷۱۱ء میں پہلی لڑائی کے تھوڑے ہی دن بعد قبضہ کر لیا تھا اور وہ اسے اُرجُذُونہ یا اَرْشذُونہ کہتے تھے (یاقوت، ۱: ۱۹۵: اُرجُذُونَہ، اور ۱: ۲۰۷: اَرْشُذُونَہ)۔ یہ شہر مدّتِ دراز تک کوہستانی صوبۂ ریّہ (Rejjo) کا (جو موجودہ صوبۂ مالقہ کے مطابق تھا) دارالسّلطنت رہا۔ تاریخ میں اس نے اہمیّت مرتد عمر بن حَفصُون کی بغاوت کے زمانے میں حاصل کی (جس کا سب سے بڑا قلعہ بپشتر (Bobastro) تھا)۔ آگے چل کر یہ سلطنت غرناطہ کا سرحدی قلعہ بنا، یہاں تک کہ جمعیت کلٹراوا (Calatrava) کے امیر اعظم (Grand Master) نے [۸۳۵ھ/]۱۴۳۱ء میں اس پر قبضہ کر لیا.

مآخذ: (۱) ڈوزی (Dozy): *Recherches sur l' histoire et la Littérature de l' Espagne* (طبع ثالث)، ۱: ۳۱۷ ببعد؛ (۲) وہی مصنّف: *Histoire des Musulmans d' Espagne*، ۲: ۳۵، ۱۸۱، ۲۰۲؛ (۳) Madoz : *Diccionario geográphico-estadistico histórico*، ۲: ۴۹۴؛ (۴) Simonet: *Descripción del reino de Granada* (طبع ثانی)، ص ۱۲۴؛ (۵) وہی مصنّف: *Historia de los Mozárabes*، ص ۹۲۸.

(سیبولڈ C. P. SEYBOLD)

----

* **اَرشْ گُول:** ساحل الجزائر پر ایک شہر، جواب ناپید ہے اور پہلے اوران (Oran) اور مرّاکُش کی سرحد کے درمیان دریاے تفنہ (Tafna) کے دہانے پر جزیرۂ راشقون (Rachgoun) کے مقابل آباد تھا، جس کے نام کی وجہ سے اسے بقاے دوام حاصل ہوئی.

اس مسلم شہر کا ذکر، جس نے شاہ سائی فیکس (Syphax) کے دارالسلطنت پورٹس سیجینسس (Portus Sigensis)، یعنی بندرگاہ سیگا (Siga)، کی جگہ لے لی تھی، پہلی مرتبہ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس طرح ملتا ہے کہ ادریس اوّل نے اسے اپنے بھائی عیسیٰ بن محمد بن سلیمان کو عطا کیا۔ چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں ابن حَوقَل نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ شہر انھیں دنوں مِکْناسہ بربروں کے امیر نے، جو قرطبہ کے خلیفہ الناصر کا باج گزار رہا تھا، دوبارہ تعمیر کیا تھا۔ چند سال بعد البَکْری ارش گول کی بابت کہتا ہے کہ ''یہ ساحل تلمسان پر ایک شہر ہے، جس میں ایک بندرگاہ موجود ہے، جہاں چھوٹے جہاز آ سکتے ہیں اور اس کے گرد ایک فصیل ہے، جس میں چار دروازے ہیں۔ شہر کے اندر ایک سات دالانوں کی مسجد اور دو حمام ہیں، جن میں سے ایک مسلمانوں سے پہلے کا ہے''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے یہ شہر پرانے شہر کے آثار پر بسایا تھا۔ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں الاِدْرِیسی نے اسے محض ایک آباد مقام کہا ہے، جو کچھ عرصہ پہلے ایک مستحکم مقام تھا اور جہاں جہاز تازہ پانی لے سکتے تھے.

[بظاہر] سیاسی تغیّرات اس شہر کے زوال کا سبب بنے۔ القیروان کے فاطمیوں اور قرطبہ کے بنی امیّہ کی باہمی کشاکش کے دوران میں (چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی) یہاں کے ادریسی حکمران نکال دیے گئے اور شہر کے باشندوں کو ہسپانیہ بھیج دیا گیا۔ اہلِ اندلس نے اسے پھر کسی حد تک آباد کیا، لیکن پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اسے دوبارہ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ شہر ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں المرابطون کے بنو غانیہ کی دَست بُرد کا شکار ہوا اور دسویں صدی ہجری/سولھویں صدی عیسوی میں جب ہسپانویوں نے اوران (Oran) کے ساحل پر حملے شروع کیے تو یہاں کے باشندے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے اور شہر ہمیشہ کے لیے ویران ہو گیا.

مآخذ: (۱) ابن حَوقَل، مترجمۂ دیسلان (de Slane)، در *JA*، ۲ ۱۸۴۲ء، ۱: ۱۸۷؛ (۲) البکری: متن، الجزائر ۱۹۱۱ء، ص ۷۹-۸۰؛ ترجمہ، الجزائر ۱۹۱۲ء، ص ۱۶۱؛ (۳) الادریسی، طبع ڈوزی (Dozy) و دخویہ (de Goeje)، ص ۱۷۲؛ ترجمہ، ص ۲۰۶؛ (۴) الحسن بن محمد الوزّان الزَّیَّاتی Leo Africanus: *Il viaggio*، طبع راموسیو (Ramusio)، وینس ۱۸۹۲ء، ص ۱۰۷، (مترجمۂ Épaulard، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۳۳۰-۳۳۱)؛ (۵) Gsell: *Atlas arihéologiques*، ورق ۳۱، شمارہ ۲.

(G. MARÇAIS)

* **اَرشِیْن:** رکّ بہ ذِراع.

----

* **اَرض:** زمین۔ کُرۂ زمین کے لیے دیکھیے مادّۂ کرۃ الارض۔ قانون اراضی کے لیے دیکھیے اِقطاع؛ تیمار؛ خاصّ؛ خالصہ؛ خَراج؛ زِعامت؛ سیُورغال [آآ، لائڈن، طبع دوم]؛ عُشر؛ قَطیعہ؛ مَترُوک [در آآ، لائڈن، طبع دوم]؛ مَحْلُول [در آآ، لائڈن، طبع دوم]؛ مِساحہ؛ مُقاسَمہ؛ مُقاطَعہ [در آآ، لائڈن، طبع دوم]؛ مَوات [در آآ، لائڈن، طبع دوم]؛ مِلْک؛ وَقْف.

----

* **اَرَضَۃ:** (نیز اَرْضَہ؛ عربی) دیمک (termes arda، سفید چیونٹی)۔ یہ کیڑا تمام گرم ممالک میں عرض بلد ۴۰° شمالی اور جنوبی تک پایا جاتا ہے، لیکن اس کی بابت ہماری معلومات ابھی تک بہت محدود ہیں؛ عربوں کی معلومات بھی اس کے متعلق کچھ ایسی ہی تھیں، کم از کم جہاں تک اس کی اُس نوع کا تعلق ہے جو عالم اِسلام کی حدود میں پائی جاتی تھی۔ عرب مصنّفین نے جس کیڑے کا حال بیان کیا ہے وہ سفید چیونٹی ہے، جس کی چند اقسام مصر میں ملتی ہیں اور بیش تر دریاے نیل کے زیادہ اوپر کی طرف نوبیا میں اور سب سے زیادہ کثرت کے ساتھ سودان میں۔ عربوں نے بیان کیا کہ ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی زندگی کے بعض حصّوں میں پر بھی نکل آتے ہیں (بقول قزوینی ''ایک سال بعد'')، لیکن وہ یہ نہ جانتے تھے کہ اس چیز کا تعلق ان کی جنسی زندگی سے کیا ہے؛ تاہم وہ دیمک کی معاشرتی زندگی، مخروطی شکل کی مٹی کے ڈھیر، جن میں بے شمار زمین دوز راستے ہوتے ہیں، بنانے میں ان کیڑوں کی مشترکہ محنت، چیونٹیوں سے ان کی جنگ اور بالخصوص لکڑی کو برباد کرنے میں ان کے عمل سے، جس کی بنا پر وہ ایک وبا سمجھے جاتے ہیں، بخوبی واقف تھے۔ ان کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لیے سنکھیا اور گوبر کارآمد خیال کیے جاتے تھے۔ دیمک کا ہوکا اور ان سے جو نقصان پہنچتا ہے دونوں ضرب المثل بن گئے تھے اور ان کی بابت عوام کا یہ وہم کہ وہ موت کا پیش خیمہ ہیں بہت پرانا معلوم ہوتا ہے۔ قرآن [حکیم] (۳۴ [سباء]: ۱۴) کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ [حضرت] سلیمانؑ کی موت کا پتا اس طرح چلا کہ ان کے عصا کو [جس کے سہارے وہ کھڑے تھے] زمین کے ایک کیڑے [دابّۃ الارض] نے

کھا لیا تھا [فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ]۔ شمالی افریقہ میں لوگ اب تک یہ کہتے ہیں کہ "جب کوئی شخص مرنے لگتا ہے تو دیمک آ جاتی ہے، کیونکہ اسے اس کا بخوبی علم ہوتا ہے"۔

مآخذ: (۱) القزوینی (طبع وسٹنفلٹ)، ۱: ۴۲۸؛ (۲) الدّمیری، ۱: ۲۴ (مترجمۂ جیکار (Jayakar)، ۱: ۳۹ بعد)؛ (۳) ہارٹمان (Hartmann): *Reise des Baron Barnim*، ص ۲۸۳ - ۲۸۶، ۴۴۳، ۶۴۳؛ (۴) Brehm: *Tierleben* (طبع ثالث ۱۸۹۲ء)، ۹: ۵۶۰ بعد.

(ہِلّ HELL)

---

* **اِرطُغرُل:** (۱) سلیمان شاہ کا بیٹا اور ترکی شاہی خاندان اور سلطنت کے بانی عثمانِ اوّل کا باپ۔ قدیم ترین روایت کے مطابق، جو عاشق پاشا زادہ کی تصنیف میں محفوظ ہے، اس نے پاسِین اووہ اور سوُرملی چقوری سے چار سو خانہ بدوش ترکمان گھرانوں کے ساتھ ایشیاے کوچک کی طرف نقلِ مکان کیا، جہاں سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے قرہ جہ حصار اور بیلہ جک (Biledjik) کے درمیان سورگوُد (Sögüd) کا ضلع موسمِ سرما کی چراگاہ (قِشلاق) اور اِرمنی بلی (Ermenibeli) اور دَومانج ([طومانیچ] Domanič) کی پہاڑیاں موسمِ گرما کی چراگاہ (یایلاق) کے طور پر عطا کر دیں۔ قرہ جہ حصار اور بیلہ جک اس وقت بوزنطیوں کے پاس تھے، لیکن وہ علاء الدین کو خراج ادا کرتے تھے۔ گرمیان کا والی علی شیر افیون قرہ حصار کے متصلہ ضلع کا حاکم تھا۔ ارطغرل نے سورگوُد میں سکونت اختیار کی اور وہیں مدفون ہوا۔ [ایک روایت یہ ہے کہ اِرطغرل خراسان میں کسی جنگ میں مارا گیا؛ چنانچہ حامدی اپنی منظوم تاریخ آلِ عثمان میں، جو اس نے سلطان بایزید ثانی کو پیش کی تھی، کہتا ہے:

اولدی اِرطغرل خراسان دہ شہید
شکری یہ اولا شدی اول شاہِ سعید
نسل ارطغرل دن اول شاہِ جہان
روم دہ عثمان بے اولمشدر عیان

(آ، ت، بذیرِ مادّہ۔] اس نے کبھی کوئی جنگ نہیں کی۔ اس کے تین بیٹے تھے: عثمان، گوُندوز (Gündüz) اور سَرَوُیتی (Saruyati) (جو سَرُوبالی یا ساوَجی بھی کہلاتا تھا)۔ ان میں سے عثمان اس کا جانشین ہوا۔ بقول نشری، (*ZDGM*، ۱۳: ۱۸۸ - ۱۹۶) ارطغرل نے علاء الدین کیقباد اوّل (۶۱۶ - ۶۳۴ھ / ۱۲۱۹ - ۱۲۳۶ء) کے عہد میں نقلِ وطن کیا اور موخّر الذکر کی طرف سے وہ برابر تاتاریوں سے جنگ کرتا رہا۔ اس نے قرہ جہ حصار اور کوتاہیہ کو فتح کیا اور علاء الدین کیقباد ثانی کے عہد (ساتویں صدی ہجری کے آخر) تک زندہ رہا۔ بعد کے مؤرّخین اس سے بعض اَور فتوحات بھی منسوب کرتے ہیں (قب وقائع، مترجمۂ Leunclavius: *Hist. Mus.*، ص ۹۷ بعد؛ Chalkokondyles، ص ۱۲ بعد؛ Phrantzes، ص ۶۸ - ۷۷، لیکن انھوں نے Ορθογρόυλης، 'Ερτογρόυλης'، کے متعلق اپنے بیانات ترکی تواریخ سے اخذ کیے ہیں)۔ سعد الدین (۱: ۱۵، قب ص ۶۵) کا بیان ہے کہ وہ ۶۸۰ھ / ۱۲۸۱ - ۱۲۸۲ء میں نوے سال سے زیادہ عمر پا کر فوت ہوا۔ (Leuncl.: *Ann.*، ص ۳، *Hist.*، ج ۳) کے اندازے کے مطابق اس نے ۶۸۷ھ میں ترانوے سال کی عمر میں وفات پائی اور فرانزِس (Phrantzes) اس کا سنہ انتقال ۶۷۷۳ عالمی = ۱۲۶۴ - ۱۲۶۵ء اور اس کی عمر ستترّ سال بتاتا ہے۔ اس کی زندگی سے متعلق روایتوں میں سے ہم مندرجۂ ذیل کو تاریخی اعتبار سے قابلِ وثوق سمجھ سکتے ہیں: یہ کہ ارطغرل اپنے ترکمان قبیلے ("boy") کے ہمراہ سورگوُد میں قونیہ کے سلجوق سلاطین کے سرحدی بک یا امیر (اوُج بیگری) کی حیثیت سے متمکن ہوا، نیز یہ کہ وہ تاتاریوں کے خلاف اپنے آقا کی جنگوں میں شریک رہا اور کبھی کبھی اس کی طرف سے بوزنطی علاقے میں تاخت کرتا رہا۔

مآخذ: (۱) مُکرمین خلیل: دُستور نامۂ اِنوری مدخلی، استانبول ۱۹۳۰ء؛ (۲) P. Wittek: *Deux chopitres de l' Histoire des Turcs de Roum Byzantion*، ۱۹۳۵ء، ۱۱: ۳۰۳ بعد؛ (۳) وہی مصنف: *The Rise of the Ottoman Empire*، لنڈن ۱۹۳۸ء؛ (۴) فؤاد کوپرولو: *Les Origines de l'Empire Ottoman*، پیرس ۱۹۱۵ء، ص ۲۲ بعد؛ (۵) وہی مصنف: عثمانلیلر ٹی اتنیک منشأی، بلیتن، انقرہ ۱۹۴۳ء، ج ۷، شمارہ ۲۸: ص ۲۱۹ - ۳۰۳؛ (۶) عدنان اِرضی در بلیتن، انقرہ ۱۹۴۰ء، ج ۴، شمارہ ۱۴/ ۱۵: ص ۱۷ - ۲؛ ماخوذ از [آ، ت، بذیلِ مادّہ]۔

(۲) [یلدیرم سلطان] بایزید اوّل کا سب سے بڑا بیٹا، جس کا سنہ ولادت ۷۷۸ھ / ۱۳۷۶ - ۱۳۷۷ء ہے (اسمٰعیل بلیغ: گُلدستہ، ص ۴۰)۔ اس کے والد نے اسے صاروخان اور قرہ سی کے متحدہ ضلعوں کا والی مقرر کیا (نشری، در *ZDMG*، ۱۵: ۳۳۵؛ Leuncl.: *Hist. Mus.*، ص ۳۱۷، ۳۳۶ بعد؛ قب ص ۳۳۷ بعد؛ بقول سعد الدین، ۱: ۱۷۸، آیدینلی کا) اور ۷۹۸ھ کے قریب اس نے وفات پائی (قب Leuncl.، مقام مذکور)، یعنی یقیناً تیمور کے حملے سے پہلے۔ وہ اس مسجد میں مدفون ہوا جو اس نے بروسہ میں بنوائی تھی) سعد الدین، ۱: ۱۲۵؛ گُلدستہ، مقام مذکور)۔ Leuncl. (کتاب مذکور، ص ۱۷۵؛ قب ۳۴۷) نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ وہ سیواس کے قاضی برہان الدین کے خلاف جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ Chalkokondyles، ص ۱۴۵ - ۱۴۷، کے بیان کے مطابق اسے تیمور نے ۱۳۹۶ء میں سیواس پر قبضے کے وقت قید کر لیا اور بعد میں اسے قتل کر دیا۔

(مورٹمان J. H. MORDTMANN)

---

* **اُرغَن:** اُرغنُون، مصنوعی طور پر ہوا کے زور سے بجنے والا آلۂ موسیقی، جو

اَرگن (Organ) کہلاتا ہے۔ یونانیوں کے ایک قسم کے تاردار باجے کو بھی اس نام سے موسوم کیا جاتا تھا، جیسے کہ افلاطون (Plato) کا ὄργανον (*Republ.*، c ۳۹۹)؛ دیکھیے المسعودی: مُرُوج الذَّهب (۹۱:۸)، جہاں اُرغن ایک تاردار ساز کو کہا گیا ہے اور اُرغُنُون ایک مصنوعی طور پر ہوا سے بجنے والے ساز کو؛ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی اس لفظ کو ایک قسم کے راگ کے لیے استعمال کرتے تھے (برھان قاطع)، جو قرونِ وسطٰی کے اَرگنُم (Organum) سے کسی قدر مشابہت رکھتا تھا۔ ہوا کی مصنوعی رَو سے بجنے والے باجے کی دو قسموں سے مسلمانوں کو واقفیت تھی، یعنی ہوائی ارغن اور مائی ارغن۔ مُؤخّرُ الذّکر کی دو قسمیں معروف تھیں: ایک میں پانی کے ذریعے ہوا کا دباؤ پیدا کیا جاتا تھا اور ایک میں پانی کے ذریعے ہوا کے دباؤ کو یکساں رکھا جاتا تھا۔ مسلمان مؤرّخین کا افلاطون (برھانِ قاطع) اور ارسطو (حاجی خلیفہ، ۴: ۲۵۸؛ فخر الدین الرّازی، ورق ۱۵۴ب) دونوں کے بارے میں خیال تھا کہ انھوں نے ارغن ایجاد کیا تھا، اگرچہ اس ضمن میں مُورِسْطُس [رکّ بآن] کا دعوی بھی قابلِ لحاظ ہے۔

کتاب الاغانی (طبع دساسی de Sacy، ۹: ۹۰) میں ہمیں ایک اُرغَن (متن میں ارغن مرقوم ہے) کا ذکر ملتا ہے، جو المهدی کی بیٹی عُلَیّہ (م ۸۲۵ء) کے شروع زمانے سے متعلّق ہے اور ابن خُرّداذبہ (مُروج الذهب، ۹۱:۸) ایک رسمی تقریر کے ضمن میں، جو المعتمد (م ۸۹۳ء) کے سامنے کی گئی تھی، اس ساز کا ذکر کرتا ہے اور دونوں روایتوں میں یہ آلہ اہلِ روم سے منسوب کیا گیا ہے۔ بعد کے حوالوں کے لیے دیکھیے کتاب الاَعْلاق، از ابن رُسْتَہ (*BGA*، ۷: ۱۲۳)، جہاں اُسے اُرقُنا (قب اُرقُنُو، در ڈوزی Dozy) لکھا گیا ہے؛ مفاتیح العلوم (ص ۲۳۶) میں بشکل اُرغانون: رسائل اخوان الصفا (مطبوعۂ بمبئی، ۱: ۹۷)، جہاں ایک مائی آلے کی کیفیت بیان کی گئی ہے؛ الفہرست (ص ۲۷۰، ۲۸۵)؛ دسویں صدی کے سریانی ـ عربی لُغات نویس Payne-Smith: *Thes. Syr.*، ص ۹۷۷ ـ ۹۷۸)؛ ابن سینا، در شِفاء (ورق ۱۷۳) اور رسائل فی الحکمۃ (ص ۷۷)، جس میں ارغن کی جگہ اُرغُل درج ہے (قب جدید اَرغول، *MFOB*، ۶: ۲۹، اور اَرغُل، در Freytag: *Chrest.*، (ص ۴۷)؛ اِبنِ زَیْلَہ اپنی کتاب الکافی (ورق ۲۳۵ب) میں گیارھویں صدی کی لاطینی عربی لغات *Glossarium Latino-Arabicum*، (ص ۵۶۳: وَرْغَن)؛ ابن حزم اندلس میں (سفینۃُ المُلْک، ص ۴۷۳)؛ ابن ابی اُصَیْبِعَہ (۲: ۱۵۵، ۱۶۳)، جس نے ارغن بنانے والے عربوں کے نام لکھے ہیں؛ الآملی، در نفائس الفنون (ورق ۴۳۹ب)؛ ابن غَیْبی، در جامع الألحان (ورق ۷۸) اور اِوْلیاء چلبی (*Travels* [سیاحت نامہ]، ۱/۲: ۲۲۶).

الفہرست (ص ۲۷۰، قب ص ۲۸۵) میں مُوزطُس یا مُورِسْطُس [رکّ بآن] کو اُرغنِ البُوقی (flue-pipe organ) اور ارغن الزَّمری (reed-pipe organ) کے متعلّق تصانیف کا مصنف قرار دیا گیا ہے۔ ابن القِفطی (ص ۳۲۲) اور ابو الفداء (تاریخ مختصر البشر، ص ۱۵۶) نے بھی یہی لکھا ہے۔ مُورِسْطُس کی یہ تصنیفات محفوظ رہی ہیں اور ان کے نسخے کئی کتب خانوں میں مل سکتے ہیں (بیروت، قسطنطینیہ اور برٹش میوزیم)۔ بیروت کے قلمی نسخے کے متون Père Cheikho نے مَشْرِق *Machriq* (ج ۹) میں شائع کر دیے ہیں اور ترجمے جزوی یا کلی طور پر فرانسیسی زبان میں کارا دوو (Baron Carra de Vaux) نے، جرمن میں ویڈمان (Dr. Wiedemann) نے اور انگریزی میں فارمر (Dr. Farmer) نے شائع کیے ہیں۔

ہوائی اُرغَن (Pneumatic organ): کتاب الاغانی (طبع دساسی، ۹: ۹۰) میں جس آلے کا ذکر ہے وہ غالبًا ہوائی ارغن تھا۔ مُورِسْطُس نے جس مائی آلے کی کیفیت بیان کی ہے وہ بہت ابتدائی نمونے کا ہے، جس کی دھونکنیوں میں مُنہ سے ہوا بھری جاتی ہے، جو ایک ایسا طریقِ عمل ہے جس کے بارے میں مورسطس کی تحریروں کی دریافت سے پہلے اب تک محض گمان ہی کیا جاتا تھا (انسائیکلوپیڈیا بر ٹانیکا *Encyclopaedia Britannica*، طبع یازدہم، ۲: ۲۲۶)۔ مورسطس اسے ارغنون الزَّمری یعنی reed-pipe organ، کہتا ہے۔ ابن غَیبی نے جس ارغن کی کیفیت بیان کی ہے وہ اس نمونے کا ہے جسے portative کہا جاتا ہے [یعنی جسے ہاتھ میں اٹھا کر بجا سکتے ہیں].

مائی ارغن (hydraulic air compressor): مسلمانوں کو اس کا علم فِیلو (Philo) کی (کتاب فِیلُون فی الحِیَل الرّوحانیۃ و مِخانِیقا الماء)، ہیرو (Hero) کی "Pneumatics" اور "Mechanics" (کتاب الحِیل الرّوحانیۃ) اور ارشمیدس (Archimedes) اور پرگا (perga) کے Appolonius کی Automatic Wind Instrumentatist (صنعۃ آلۃ الزّامر) کے عربی تراجم کے ذریعے ہوا۔ اسی اصول پر بنو موسٰی نے اپنا خود کار ارغن بنایا تھا، جس کی کیفیت ایک رسالے بنام "ایک آلۂ موسیقی جو خود بخود بجتا ہے" (الآلۃ الّتی تزَمِر بنفسہا) میں بیان کی گئی ہے۔ مؤخّر الذکر کا متن، طبع پروفیسر کولن جیٹس (M. Collangettes)، رسالۂ مشرق *Machriq* (۹: ۴۴۴) میں شائع ہوا تھا اور اس کے ترجمے پروفیسر ویڈمان (بزبانِ جرمن) اور فارمر (Dr. Farmer) (بزبانِ انگریزی) نے کیے ہیں۔

مائی ارغن (hydraulic pressure stabiliser): یہ آلہ مائی (hydraulis) تھا، جس کا عربی میں ذکر سب سے پہلے (اگرچہ بلا تخصیص نام) ارسطو سے فرضی طور پر منسوب کتاب السّیاسۃ میں ملتا ہے، جس کا ترجمہ یونانی سے سریانی ترجمے کی وساطت سے یوحنّا بن البطریق (م ۸۱۵ء) نے عربی میں کیا تھا۔ کتاب مذکور کی رُو سے یہ ایک سازِ حربی ہے جس کی آواز ساٹھ میل تک سُنی جا سکتی تھی (قب فارمر (Farmer): *Studies in Oriental Musical Instruments*، باب ۳، ص ۲۷۰، متن اور ترجمے کے لیے)۔ مُورِسْطُس نے اس آلے کی مفصّل کیفیت بیان کی ہے اور اس قسم کا آلہ یقینًا اُن آلات سے قدیم تر

ہے جس کے بارے میں ہیرو (Hero) یا وٹرو ویئس (Vitruvius) نے لکھا ہے۔ برخلاف یہودیوں (*Idrablis, ohirdaulis*) اور شامیوں (hedrula) کے، عربوں نے یونانی لفظ Hydraulis کو اپنی زبان میں اخذ نہیں کیا۔ مورسطس اسے ارغُنون البُوقی (flue-pipe organ) کہتا ہے۔

مشرق میں اسلامی تاریخ کے کسی دَور میں ارغن کو عود (lute)، نَے (flute)، قانون (psaltery)، کمانچہ (viol) یا دفّ (tambourine) کے معنی میں آلۂ موسیقی تصوّر نہیں کیا گیا: مسلم سپین کے لیے قبؔ سفینة المُلک (ص ۴۷۳)۔ اسے غالبًا اَور بہت سی دلچسپ میکانیکی مخترعات (حِیَل) کے طور پر مقبولیت حاصل تھی، جیسے کہ مائی گھڑی (clepsydra)، موسیقی کا درخت اور دیگر اعجوبے، جو ہارون الرشید کے وقت سے مقبول عام ہوتے گئے (دیکھیے Hauser: *Über das Kitāb al-Ḥijal...*، Erlangen ۱۹۲۲ء؛ *Isl.*، ۸: ۵۵)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بہت اغلب ہے کہ مشرق میں مائی اُرغَن (hydraulis) کے از سرِ نو رواج پانے کا سبب مسلمان تھے اور شاید مغرب کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ بوزنطیم (Byzantium) میں بظاہر مائی ارغن متروک ہو چکا تھا۔ پانی کے ذریعے ہوا کے دباؤ کو یکساں رکھنے کے اصول کی جگہ وزن دار دھونکنی؟ (barystathmic) کے اصول نے لے لی تھی، جیسا کہ ہوائی ارغن میں ہوتا ہے۔ جب آٹھویں صدی کے خاتمے پر یا نویں صدی کے شروع میں مسلمانوں نے مائی ارغن (hydraulis) بنانا شروع کیا، جس کا علم اُنھوں نے یونانی (غالبًا مورسطس کے) ترجموں کے ذریعے حاصل کر لیا تھا، تو اہلِ روم (بوزنطیوں) نے بھی اس آلے کو دوبارہ اختیار کر لیا، جسے وہ صدیوں سے ترک کر چکے تھے اور جس کی ساخت سے انھیں غالبًا کچھ بھی واقفیت باقی نہیں رہی تھی۔

یہ روایت کہ ہارون نے شارلمان (Charlemagne) کو ایک ارغن تحفۃً دیا تھا (دیکھیے *Hist. littéraire de la France*، ۱۲: ۴۶۷؛ Larousse: *La grande Encycl-opaédie*؛ وہی مصنف: *Le grand dictionnaire*؛ Hopkins و Rimbault: *The Organ*؛ Grove: *Dictionary of Music*؛ Audsley: *Art of Organ Buil-ding*، در *al-Machriq*، ۹: ۲۰) محض ایک کہانی ہے، جس کا ماخذ Madame de Genlis کی کتاب *Les Chevaliers du Cygne* میں مندرج ایک حاشیے کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ [اس کے برعکس عربی زبان میں اس سے ملتی جلتی ایک کہانی موجود ہے، جو نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے ایک مخطوطے میں، جس کا نام کشف الھموم والکرب ہے، پائی جاتی ہے اور جو استانبول میں محفوظ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک حیرت انگیز ارغن کے بنانے والے کا نام تقی الدین الفارابی یا فریابی تھا، جس کا کسی جعفر نے خلیفہ المأمون سے تعارف کروایا تھا۔ خلیفہ نے یہ اختیار دیا تھا کہ تقی الدین کو وہ تمام سامان مہیا کر دیا جائے جس کی ایک حیرت انگیز ارغن کے بنانے میں ضرورت پیش آئے اور اس کا نام موسیقہ تجویز کیا گیا۔ اس بیان کے مطابق یہ آلہ محض ایک میکانکی ساخت کا ہوائی ساز نہ تھا بلکہ تاروں والے آلۂ موسیقی کا کام بھی دیتا تھا، لیکن اس نام نہاد موجد کا نام بتاتا ہے کہ یہ بیان محض ایک فرضی قصّہ ہے۔ اس ساز کی تشریح میں جو موسیقی کی فنّی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں وہ بعد کی پیداوار ہیں (اضافہ از مکتوبِ فارمر بنام ادارہ، مورّخہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۷ء)۔] یہاں تک کہ قرونِ وسطٰی کی تصانیف میں یہ جو واقعہ بیان کیا گیا ہے (*Monumenta Germaniae historica*، ۱: ۱۴۰) کہ ہارون نے شارلمان کو ایک مائی گھڑی (clepsydra) تحفے میں دی، اسے بھی بعض حلقوں میں مشتبہ سمجھا جاتا ہے (*Isl.*، ۳: ۴۰۹ و ۴: ۳۳۳)۔ Cl. Huart (*Histoire des arabes*، ۲: ۱۰۷) اور ہائیڈ Heyde (*Hist. du Commerce du Levant*، ۱: ۹۰) کا یہ کہنا یقیناً غلط ہے کہ ہارون نے جو تحائف شارلمان (Charlemagne) کو بھیجے تھے اُن میں آلاتِ موسیقی بھی شامل تھے۔

اس کے برعکس یہ چیز بالکل قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے کہ چین میں ارغن (مائی؟) کی ابتدائی ترویج کا باعث مغل تھے۔ چینی یوآن شیھ (*Yüan Shih*) میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک ارغن چُنگ تُنگ (Chung t'ung) کی مسلمان سلطنتوں نے تحفے کے طور پر دیا تھا (۱۲۶۰ - ۱۲۶۴ء)؛ بحالیکہ ایک اَور تصنیف سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ یہ "مغربی ممالک کی جانب سے ایک تحفہ تھا" اور قُبلائی (Ḳubilai) نے خود اس میں اصلاح کی تھی (*JRAS*، *China Branch*، ۱۹۰۸ء؛ *JRAS*، ۱۹۲۶ء)۔ ہم یہ تصوّر کر سکتے ہیں کہ اس قسم کا آلۂ موسیقی سب سے پہلے ہلاگو کی جانب سے قُبلائی کے لیے تحفے کے طور پر چین میں پہنچا اور یہ کہ وہ شام میں بنایا گیا تھا، جہاں اس زمانے میں اس نمونے کے آلات بنائے جاتے تھے (ابن ابی اُصَیبعہ، ۲: ۱۵۵ - ۱۶۳)۔ بعض فارسی لغات نویس (Richardson اور Steingass) طُولُنبہ کی تعریف "ایک مائی (hydraulic) آلۂ موسیقی" کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک "آبی مشین" یا زیادہ اغلب یہ ہے کہ ایک قسم کا "آب کش" ہوتا تھا۔

[عہدِ حاضر کے مصری ارغول کا نام صاف طور پر یونانی لفظ ارغون کی معرّب شکل ہے، ہر چند کہ یہ وہ ساز نہیں جسے میکانکی طور پر بجایا جاتا ہے اور جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ارغول کی تشریح کے لیے دیکھیے مقالہ مزمار (اضافہ از مکتوبِ فارمر، بنام ادارہ، مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء)]۔

مآخذ: مکمل تبصرے اور فہرست مآخذ کے لیے دیکھیے (۱) فارمر (Farmer): *The Organ of the Ancients; From Eastern Sources (Hebrew, Syriac and Arabic)*، لنڈن ۱۹۳۱ء؛ اور (۲) E. Wiedemann: *Byzantinische und arabische akustische Instrumente* (*Arachiv für die Geschichte der Naturwissenschaften und der Technik*، ج ۸)، لائپزگ ۱۹۱۹ء؛ علاوہ ان تصانیف کے

جو مادّے میں مذکور ہیں مندرجۂ ذیل سے بھی استفادہ کرنا چاہیے: (۳) فارمر (Farmer): *Byzantine Musical Instruments in the Ninth Century*، لنڈن ۱۹۲۵ء (=*JRAS*، حِصۂ دوم، ۱۹۲۵ء)؛ (۴) وہی مصنف: *Studies in Oriental Musical Instruments*، لنڈن ۱۹۳۱ء؛ (۵) Moule: *A Western Organ in Mediaeval China*، (*JRAS*، ۱۹۲۶ء)؛ (۶) فخر الدین الرّازی: جامع العلوم، مخطوطۂ برٹش میوزیم، شمارہ Or. ۲۹۷۲؛ (۷) W. Schmidt: *Herons von Alexandria Druck werke und Automatentheater*، لائپزگ ۱۸۸۹ء؛ (۸) Tannery: *L' Invention de l' hydraulis* (در *Reveu des e'tudes grecques*)، ج۲۱، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۹) کارادوو (Carra de Vaux): *Le livre des appareils pneumatiques et des machines hydrauliques, par Philon de Byzance* (در *NE*، ج۳۸)، پیرس ۱۹۰۳ء؛ (۱۰) وہی مصنف: *L' Invention de l' hydraulis*، در *Revue des études grecques*، ج۲۱، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۱۱) وہی مصنّف: *Notices sur deux manuscrits arabes*، در *JA*، ۱۸۹۱ء؛ (۱۲) وہی مصنف: *Notes d' histoire des sciences*، در *JA*، نومبر-دسمبر ۱۹۱۷ء؛ (۱۳) E. Wiedemann: *Über Musikautomaten bei den Arabern*، (در *Centenario della Nascita Michele Amari*، ۱۹۰۹ء)؛ (۱۴) Wiedemann و Hausser: *Uhr des Archimedes*، (در *Nova acta Abhandl. der Kaiserl. Leop.-Carol. Deutschen Akad. der Naturforscher*، ج ۱۰۳)، Halle ۱۹۱۸ء؛ نیز دیکھیے اسی کتاب کی ج ۱۰۰، برائے *Über die Uhren im Bereich der islamischen Kultur*؛ (۱۵) ابن سینا: الشِّفاء، مخطوطۂ انڈیا آفس، شمارہ ۱۸۱۱؛ (۱۶) اِبن غَیْبی: جامع الألحان، بوڈلین لائبریری، مخطوطہ Marsh، ۸۲۸؛ (۱۷) ابن زَیلہ: کتاب الکافی، موزۂ برطانیہ، مخطوطہ، شمارہ Or. ۲۳۶۱؛ (۱۸) الآمُولی: نفائس الفُنُون، موزۂ برطانیہ، مخطوطہ، شمارہ Add.۱۶۸۲۷؛ (۱۹) ارشمیدس (Archimedes): آلة الزّامر؛ (۲۰) Appolonius: صنعة الزّامِر، موزۂ برطانیہ، مخطوطہ، شمارہ Add.۲۳۳۹۱؛ [نیز دیکھیے ذیل کے مقالات: اوتار، طبل، طنبور، عود، غنا، مزمار، موسیقی].

(H. G. FARMER فارمر)

اَرْغَنَہ: رکّ بہ اِرْگنی. *

اَرْغُوْن: رکّ بہ ایلخانیہ. *

Urdū
Encyclopaedia of Islām

Under the Auspices

of

Department of Urdū Encyclopaedia of Islām

THE UNIVERSITY OF THE PUNJAB

LAHORE

Nastaʻlīq Edition

Vol. I

(Aʻīn ___ Arghūn)

First Print: 1439 / 2017

جملہ حقوق بحقِ دانش گاہِ پنجاب محفوظ ہیں

مقالہ نگار یا کسی اور شخص کو کلی یا جزوی طور پر اس
کا کوئی مقالہ یا تعلیقہ یا اس کے کسی حصّے کا ترجمہ
شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے